B9ED101CCT

تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

(Philosophical Foundations of Education)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

برائے

بیچلر آف ایجوکیشن

(سمسٹر اول)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی،

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

© مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس۔ بیچلر آف ایجوکیشن

ISBN: 978-93-80322-10-0
First Edition: August, 2018
Second Edition: July, 2019
Third Edition: March, 2021

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	مارچ، 2021
تعداد	:	3000
کمپوزنگ	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان
مطبع	:	کرشک پرنٹ سولیوشنس، حیدرآباد

تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

(Philosophical Foundation of Education)
for B.Ed. 1st Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in
Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

مجلس ادارت۔ اشاعت اول ودوم

(Editorial Board-1st and 2nd Edition)

مضمون مدیر

(Subject Editor)

Prof. Siddiqui Mohd. Mahmood
Department of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University

پروفیسر صدیقی محمد محمود
شعبۂ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

زبان مدیر

(Language Editor)

Prof. Wahab Qaisar (Advisor)
Direcotrate of Translation & Publication
Maulana Azad National Urdu University

پروفیسر وہاب قیصر (ایڈوائزر)
ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

(SLM Based on Distance & Regular Mode Synchronized Syllabus)

مجلس ادارت

(Editorial Board)

مضمون مدیران

(Subject Editors)

Prof. Mushtaq Ahmed I. Patel	پروفیسر مشتاق احمد آئی۔پٹیل
Prof. Education (DDE)	پروفیسر، تعلیم (ڈی ڈی ای)
Dr. Najmus Sahar	ڈاکٹر نجم السحر
Associate Professor, Education (DDE)	اسوشی ایٹ پروفیسر، تعلیم (ڈی ڈی ای)
Dr. Sayyad Aman Ubed	ڈاکٹر سید امان عبید
Associate Professor, Education (DDE)	اسوشی ایٹ پروفیسر، تعلیم (ڈی ڈی ای)
Dr. Banwaree Lal Meena	ڈاکٹر بنواری لال مینا
Assistant Professor, Education (DDE)	اسسٹنٹ پروفیسر، تعلیم (ڈی ڈی ای)

زبان مدیران

(Language Editors)

Professor Abul Kalam(Director)	پروفیسر ابوالکلام (ڈائرکٹر)
Directorate of Distance Education	نظامت فاصلاتی تعلیم
Dr. Mohd Akmal Khan	ڈاکٹر محمد اکمل خان
Guest Faculty (Urdu)	گیسٹ فیکلٹی (اردو)
Directorate of Distance Education	نظامت فاصلاتی تعلیم

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

پروگرام کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر نجم السحر ،اسوشی ایٹ پروفیسر (تعلیم)
نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین:	**اکائی نمبر**
ڈاکٹر نہال احمد انصاری، اسسٹنٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، آسنسول	اکائی 1
ڈاکٹر محمد اطہر حسین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	اکائی 2
ڈاکٹر ریاض احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، سنبھل	
ڈاکٹر محمد سہیل خان، اسوسی ایٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، سنبھل	
ڈاکٹر طیبہ نازلی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	
ڈاکٹر بدرالاسلام، اسسٹنٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، اورنگ آباد	اکائی3
ڈاکٹر محمد سہیل خان، اسوشی ایٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، سنبھل	
ڈاکٹر شاکرہ پروین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	
پروفیسر صدیقی محمد محمود، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	
ڈاکٹر شاکرہ پروین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	اکائی 4
پروفیسر صدیقی محمد محمود، شعبۂ تعلیم وتربیت، حیدرآباد	اکائی 5

پروف ریڈرس:

اول : جناب اشرف نواز

دوم : ڈاکٹر سومی، وی ایس

فائنل : ڈاکٹر نجم السحر

سرِورق : ڈاکٹر محمد اکمل خان

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورآرڈی نیٹر	9
اکائی 1:	فلسفہ اور تعلیم کا تعارف	11
اکائی 2:	ہندوستان میں تعلیم: تاریخی تناظر	34
اکائی 3:	مشرقی نظام اور مغربی فلسفۂ مکاتب	85
اکائی 4:	اقدار کی تعلیم	134
اکائی 5:	تدریس بہ حیثیت پیشہ	145
	نمونہ امتحانی پرچہ	**158**

پیغام

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل و اخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزار رہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گرد و پیش اور ماحول کے مسائل ہوں۔ وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ مبارزات (Challanges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمے داری ہے۔ چوں کہ اسی مقصد کے تحت اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔ احقر کو اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمے داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کے بعد اِس کے ذمے داران، عام اردو قارئین کے لیے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر کرا کے کتابوں کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تا کہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں۔

پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ

وائس چانسلر انچارج

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیغام

آپ تمام بخوبی واقف ہیں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا باقاعدہ آغاز 1998 میں نظامت فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا تھا۔2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا۔متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی (UGC-DEB) اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہٗ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بند کر کے خود اکتسابی مواد (SLM) از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھے بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ اِس طرح سے یونیورسٹی نے روایتی طریقۂ تعلیم سے پہلے فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اردو آبادی تک تعلیم پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل یہاں کے تدریسی پروگراموں کے لیے امبیڈکر یونیورسٹی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے نصابی مواد سے من وعن یا ترجمے کے ذریعے استفادہ کیا گیا۔ ارادہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے اپنا نصابی مواد تیار کرا لیا جائے گا اور دوسری یونیورسٹیوں کے مواد پر انحصار ختم ہو جائے گا، لیکن ارادہ اور کوشش دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے، جس کی وجہ سے اپنے خود اکتسابی مواد کی تیاری میں اچھی خاصی تاخیر ہوئی۔ بالآخیر منظّم اور جنگی پیمانے پر کام شروع ہوا، جس کے دوران میں قدم قدم پر مسائل پیش آئے۔ مگر کوششیں جاری ہیں، نتیجتاً بہت تیزی سے یونیورسٹی نے اپنے نصابی مواد کی اشاعت شروع کر دی ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور 5 ذیلی علاقائی مراکز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی) کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ ڈی ڈی اِی نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر ابوالکلام

ڈائرکٹر، نظامتِ فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

فلسفہ میں زندگی کے تمام مسائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان مسائل کے آخری حل کو معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعلیم جیسا بامقصد عمل، فلسفے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ فلسفہ اور تعلیم کے رشتے کو جسم اور روح کے رشتے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ اور زندگی بھی ایک ہی سکے کے دو رخ قرار پائے۔ فلسفہ زندگی تعلیم کی شکل میں عملی روپ میں سامنے آتا ہے۔ تعلیم کے تمام اُمور و مسائل فلسفے کے ذریعے ہی فیصل ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک معلم کے لیے فلسفے سے اور بطورِ خاص تعلیم کی فلسفیانہ بنیاد سے واقف ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔

اس کورس میں جملہ پانچ اکائیاں ہیں۔

اکائی 1۔ فلسفہ اور تعلیم کا تعارف

اس اکائی میں آپ فلسفہ اور تعلیم کے تصور اور ان کے دائرہ کار سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ فلسفہ اور تعلیم کے باہمی تعلقات کا فہم حاصل کریں گے۔ فلسفہ اور تعلیم کے مقاصد پر بھی آپ رہنمائی حاصل کریں گے۔

اکائی۔2 ہندوستان میں تعلیم: تاریخی تناظر

اس عنوان کے تحت دورِ قدیم یعنی ویدک اور بدھسٹ دور اور عہدِ وسطیٰ کے دور کی تعلیم جس میں اسلامی تعلیم بھی شامل ہوگی اس کا تاریخی جائزہ لیا جائے گا۔ دورِ جدید یعنی آزادی سے قبل اور بعد کے دور میں تعلیم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے گی۔ اس اکائی کے اختتام پر آپ چند مفکرینِ تعلیم کے خیالات سے واقف ہو سکیں گے۔

اکائی۔3 مشرقی نظام اور مغربی فلسفۂ مکاتب

یہ اکائی مشرقی اور مغربی فلسفۂ تعلیم کے مکاتب کے تعارف پر مبنی ہے۔ مشرقی فلسفوں میں سے ہم سانکھیہ، یوگا، نیایہ اور صوفی فلسفۂ تعلیم کا مطالعہ کریں گے۔ مغربی فلسفوں میں سے ہم تصوریت، فطریت، عملیت اور وجودیت کی بنیادی فکر سے واقفیت حاصل کریں گے۔

اکائی۔4 اقدار کی تعلیم

یہ اکائی اقدار کی تعلیم سے بحث کرتی ہے۔ اس میں ہم اقدار کے تصور کا مطالعہ کرتے ہوئے تعلیمِ اقدار کی ضرورت پر غور کریں گے۔ بعد ازاں اقدار کی درجہ بندی کرتے ہوئے اقدار کے بحران کی وجوہات کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ اور آخر میں خوشحال زندگی اور اقدار کے تعلق پر غور و خوض کریں گے۔

اکائی۔5 تدریس بہ حیثیت پیشہ

اس اکائی کے ذریعے آپ کو تدریس کا تعارف ایک پیشے کی حیثیت سے کرایا جائے گا۔ اس پیشے کی عظمت و وقار کے ضمن میں ضروری استعداد کیا ہوتی ہے اس کی معلومات دی جائے گی۔ اس ضمن میں معلم، معمارِ قوم کس طرح بن سکتا ہے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ معلم کی دیگر اہم حیثیات مثلاً۔ خالقِ علم، تحصیل کارِ علم وغیرہ کے بارے میں آگاہی دی جائے گی۔ ہر پیشے کی ایک اخلاقیات ہوتی ہے۔ اس ضمن میں معلم کی پیشہ وارانہ اخلاقیات سے واقف کراتے ہوئے مستقبل کے سماج میں آپ سے وابستہ توقعات سے روشناس کرایا جائے گا۔

تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

(Philosophical Foundations of Education)

اکائی 1۔ فلسفہ اور تعلیم کا تعارف

(Introduction to Philosophy and Education)

اکائی کے اجزا؛

1.1 تمہید (Introduction)

1.2 مقاصد (Objectives)

1.3 فلسفہ کا تصور اور وسعت Concept and Scope of Philosophy)

1.3.1 فلسفہ کا تصور (Concept of Philosophy)

1.3.2 فلسفہ کی خصوصیات (Characteristics of Philosophy)

1.3.3 فلسفہ کی وسعت (Scope of Philosophy)

1.4 تعلیم کا تصور اور وسعت (Concept and Scope of Education)

1.5 فلسفہ اور تعلیم کا تعلق (Relationship between Philosophy and Education)

1.6 فلسفہ اور تعلیم کے مقاصد (Philosophy and Aims of Education)

1.6.1 فلسفہ اور نصاب تعلیم (Philosophy and Curriculum)

1.6.2 فلسفہ اور طریقۂ تدریس (Philosophy and Teaching Methods)

1.6.3 فلسفہ اور نظم وضبط (Philosophy and Discipline)

1.6.4 فلسفہ اور درسی کتب (Philosophy and Text Books)

1.6.5 فلسفہ اور معلم (Philosophy and Teacher)

1.7 فلسفہ تعلیم اور تعلیمی فلسفہ Philosophy of Education and Educational Philoshophy

1.7.1 فلسفۂ تعلیم (Philosophy of Education)

1.7.2 تعلیمی فلسفہ (Educational Philosophy)

1.8 یادرکھنے کے نکات (Points to Remember)

1.9 فرہنگ (Glossary)

1.10 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں(Unit End Activities)

1.11 تجویز کردہ مواد(Suggested Readings)

1.1 تمہید (Introduction)

عظیم فلسفی وہی ہوسکتا ہے جس کے پاس علم ہو۔علم ہی دانش مندی کا ذریعہ بنتا ہے۔اس طرح فلسفہ اور تعلیم کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ بلکہ فلسفہ اور تعلیم ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ کچھ دانشوروں نے زندگی کو تعلیم اور تعلیم کو زندگی مانا ہے۔انسان زندگی میں اخلاق واقدار فلسفے سے ہی حاصل کرسکتا ہے۔فلسفے میں زندگی کے مسائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔فلسفہ اور زندگی ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ان میں روح وجسم کا رشتہ ہے۔جس طرح جسم کا وجود روح کے بغیر بے معنی ہے اور روح کا وجود جسم کے بغیر بے مقصد ہے اسی طرح فلسفے کے بغیر تعلیم کا وجود بے معنی ہے اور تعلیم کے بغیر ہم فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے۔اس سبق میں ہم فلسفہ اور تعلیم کے متعلق مختلف پہلوؤں پر غور کریں گے اور ان کے مفہوم ودائرہ کار کو جانیں گے۔ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے مقاصد اور تعلیمی فلسفے کے بارے میں بھی پڑھیں گے۔

1.2 مقاصد (Objectives)

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- ☆ فلسفے کے مفہوم اور دائرہ کار کو بیان کرسکیں گے۔
- ☆ تعلیم کے مفہوم اور دائرہ کار کو بیان کرسکیں گے۔
- ☆ فلسفہ اور تعلیم کے باہمی تعلق کی وضاحت کرسکیں گے۔
- ☆ فلسفہ اور تعلیم کے مقاصد بیان کرسکیں گے۔
- ☆ فلسفہ تعلیم اور تعلیمی فلسفے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر پائیں گے۔

1.3 فلسفہ کا تصور اور وسعت (Concept and Scope of Philosophy)

1.3.1 فلسفہ کا تصور (Concept of Philosophy)

فلسفہ، انگریزی لفظ Philosophy کے مترادف ہے۔لفظ Philosophy یونانی لفظ Philosophie سے نکلا ہے جو Phileo اور Sophie دو لفظوں کے ملنے سے بنا ہے۔Phileo کا مطلب محبت اور Sophie کا معنی دانش مندی ہوتا ہے۔اس کا معنی یہ ہوا کہ فلسفہ دانش مندی سے محبت کو کہا جاتا ہے۔Plato نے اپنی کتاب ریپلک میں لکھا ہے کہ "جو انسان علم کو حاصل کرنے اور نئی نئی باتوں کو جاننے کے لیے دلچسپی دکھاتا ہے اور کبھی مطمئن نہیں ہوتا اسے فلسفی کہا جاتا ہے"۔

"The who has the taste for every sort of knowledge and who is curious to learn and is never satisfied may be justly termed a Philosopher") –Plato

مختلف دانشوروں نے اسے مختلف طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔چند فلسفیوں کے نظریات مندرجہ ذیل ہیں۔

"فلسفہ ایک ایسا علم ہے جو مافوق الفطرت چیزوں کی صحیح نوعیت کی کھوج کرتا ہے"۔(ارسطو)

"Philosophy is a science which discovers the real nature of supernatural elements"

Aristotle

"فلسفہ حقیقت کی صحیح نوعیت کی منطقی کھوج ہے"۔(رادھا کرشنن)

"Philosophy is the logical inquiry into the nature of reality"–RadhaKrishnan

"فلسفہ سائنس اور تنقید کا ادراک ہے"۔Kant

"Philosophy is a science and criticism of cognition"– Kant

"فلسفہ علم کی سائنس ہے"۔Fitchte

"Philosophy is the science of Knowledge"–Fitchte

فلسفہ، سچائی کی کھوج کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ یہ وہ علم ہے جو حتمی سچائی اور فطرت کے اصولوں اور ان کی وجوہات کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہ سچائی کو پرکھنے کا ایک نظریہ ہے۔ فلسفہ، زندگی کی سچائیوں کی کھوج کرکے انہیں ایک سمت عطا کرتا ہے۔

ہندوستانی فلسفے کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے لیکن صحیح معنی میں لفظ فلسفہ کا پہلا استعمال فیثا غورث (Pythagorus) نے کیا تھا اور اسے ایک مضمون کے طور پر ارسطو نے فروغ دیا۔ انسانی زندگی کے شروعاتی لمحوں میں جب انسان کو قدرت کے طریقوں کو دیکھ کر تعجب ہوا اور جب زندگی کی پیچیدگیاں اور جدوجہد میں، اس نے متضاد حالات دیکھے تو اس کے ذہن میں عدم اطمینان پیدا ہوا۔ اور اسی عدم اطمینانی نے فلسفے کو جنم دیا۔ دور قدیم میں ویدوں کا فلسفہ، بدھ کا فلسفہ اور مغرب میں یونانی فلسفہ تعجب (wonder) سے شروع ہوا مگر موجودہ مشرقی فلسفے کی بنیاد شک (doubt) ہے جیسا کہ پیٹرک نے لکھا ہے

''چوں کہ قدیم لوگوں میں فلسفہ تعجب سے شروع ہوا۔ موجودہ دور میں وہ زیادہ تر شک سے پیدا ہوتا ہے''

اس تعجب اور شک نے مختلف طرح کے مسائل کھڑے کیے۔ ان مسائل میں بنیادی بات یہ تھی کہ یہ خصوصی سوالوں کے نہیں بلکہ عمومی اور عالمگیر سوالوں سے متعلق تھے۔ اس معنی میں فلسفہ کے مسائل سائنس کے مسائل سے مختلف ہوتے ہیں جو کہ خصوصی سوالوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔

دنیا میں عام نقطۂ نظر کو وسیع کرنے اور بنیادی قوانین کی حقیقت کے بارے میں منطقی سوچ اور سنجیدہ اصول تیار کرنے کی ضرورت نے فلسفے کو ایک مضمون کے طور پر پیدا کیا۔ فلسفہ کے ذریعے قدرت اور مکمل زندگی کے راز کا پردہ فاش کیا جاتا ہے۔ انسان کیا ہے؟ اس کا وجود کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس دنیا کی فطرت و مقصد کیا ہے؟ قدرت کا نظام کیا ہے؟ اس دنیا کو کس نے بنایا؟ انسان اس دنیا میں کیوں آیا؟ موت کیا ہے؟ کیا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے؟ چاند و سورج کیا ہیں؟ مریخ کیا ہے؟ انہیں کس نے بنایا؟ ان سب سوالوں کی کھوج کرکے اس پر منطقی نظریہ قائم کرنا اور نتائج اخذ کرنا فلسفے کا کام ہے۔ حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرانا، فلسفے کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کہیں تو ان سارے سوالوں کا مطالعہ ہی فلسفہ ہے۔ چوں کہ یہ ساری باتیں بہت ہی باریک ہیں اس لیے ان پر غور و فکر کرنا، حقیقت کو سمجھنا ایک عام انسان کی ذہنی صلاحیتوں سے باہر ہے۔ اس لیے ہنڈرسن (Henderson) نے کہا کہ

''فلسفہ سب سے پیچیدہ مسائل کا مشکل اور احتیاط کے ساتھ کیا ہوا تجربہ ہے جسے انسان نے کبھی محسوس کیا ہو''۔

"Philosophy is a rigorous, disciplined, guarded analysis of some of the most difficult problems which man has ever faced." - Henderson

فلسفہ کو وسیع نظریے سے دیکھا جائے تو وہ ہر انسان فلسفی ہے جو صداقت کی کھوج کسی نہ کسی طرح کرتے رہتا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان پیدائش سے موت تک ہر روز کچھ نئے نئے تجربے کا سامنا کرتا ہے اور ان تجربوں سے وہ نئی نئی باتیں سیکھتا ہے۔جس سے نئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس کے ذہن میں نئے نئے سوال بھی آتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ صحیح کیا ہے؟ غلط کیا ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یعنی وہ ہمیشہ ایک نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے اور سچائی جاننے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے اور چوں کہ سچ کی کھوج ہی فلسفہ ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر انسان فلسفی ہے۔اس لیے ہکسلے (Huxley) کہتا ہے

''انسان اپنی زندگی فلسفہ اور دنیا کے بارے میں اپنے نظریے کے مطابق بسر کرتا ہے۔بغیر فلسفہ کے زندگی بسر کرنا ناممکن ہے''۔

"Men live in accordance with their philosophy of life, their conception of the world"- Huxley

فلسفہ کی تعریف میں کچھ فلسفی نفسیاتی پہلو پر زور دیتے ہیں تو کچھ دوسرے اقدار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

John Dewey لکھتا ہے ''جب بھی فلسفہ پر سنجیدگی سے غور کیا گیا تو ہمیشہ یہ مان لیا گیا کہ وہ علم حاصل کرنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو کہ زندگی کے طرز عمل کو متاثر کرے گا۔''

1.3.2 فلسفہ کی خصوصیات (Characteristics of Philosophy)

فلسفہ کے معنی کو سمجھنے کے بعد ہم فلسفہ کی خصوصیات کے بارے میں پڑھیں گے۔اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ فلسفہ کی پیدائش تجربہ اور حالات کے مطابق ہوتی ہے۔

☆ فلسفہ، حقیقت کی کھوج میں مسلسل لگا رہتا ہے۔

☆ فلسفہ انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔

☆ فلسفہ سائنس بھی ہے اور آرٹ بھی۔

☆ فلسفہ منطقی سوچ پیدا کرتا ہے۔

☆ فلسفہ قدرت کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

☆ فلسفہ زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کراتا ہے۔

☆ فلسفہ زندگی کے لیے اصول و اقدار کو متعین کرتا ہے۔

☆ فلسفہ دانش مندی سے محبت ہے۔

☆ فلسفہ مقامی اور عالمی دونوں ہے۔فلسفہ، حقیقت کی دانش مندانہ کھوج ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ فلسفہ کسے کہتے ہیں؟

2۔ فلسفہ کس لفظ سے نکلا ہے؟

3۔ فلسفہ کے معنیٰ کیا ہیں؟

4۔ فلسفہ کا تعارف کیا ہے؟

5۔ فلسفہ کی خصوصیات کون کون سی ہیں؟

اب آپ ان سوالوں کے جواب دیں:

1۔ فلسفہ کس لفظ سے نکلا ہے؟

2۔ فلسفہ کسے کہتے ہیں؟

3۔ فلسفہ کے متعلق مختلف فلسفیوں کی تعریفات بیان کیجیے۔

4۔ فلسفہ کی خصوصیات کو بیان کریں۔

1.3.3 فلسفہ کی وسعت (Scope of Philosophy)

فلسفہ سارے علوم کی ماں ہے اور اس کا دائرہ کار کافی وسیع ہے۔اسے مندرجہ ذیل طریقے سے ہم سمجھ سکتے ہیں مثلاً

☆ علمیات (Epistemology)

☆ مابعد الطبیعیات (Metaphysics)

☆ علم الاقدار (Axiology)

☆ فلسفۂ سائنس (Philosophy of Science)

☆ فلسفۂ سماجی سائنس (Philosophy of Social Science)

☆ فلسفۂ زبان (Semantics)

علمیات (Epistemology): علمیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جس میں علم سے متعلق مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔علم کیا ہے؟ علم کی کیا حد ہے؟ علم کا ذریعہ کیا ہے؟ ہمارے پاس جو علم ہے کیا وہ حقیقی علم ہے؟ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ دونوں کے درمیان فرق کیسے کیا جاسکتا ہے؟ تعلیم یافتہ ہونے کی سند کیا ہے؟ علم کی کون کون سی قسمیں ہیں؟ ان سارے سوالوں کا جواب اس شاخ میں معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اور اس کا فلسفیانہ تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس میں استقرائی (Inductive)، استخراجی (Deductive) طریقے، ترکیب (Synthesis) اور تجزیہ (Analysis) طریقہ کار کا استعمال ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔اس میں بنیادی طور پر ہم علم اور علم حاصل کرنے کے ذرائع کے بارے میں مطالعہ کرتے ہیں۔

مابعد الطبیعیات (Metaphysics): اس میں خالق، مخلوق، کائنات کی ابتدا و اختتام۔انسانی وجود، حیات و موت وغیرہ کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔اس بات پر بھی بحث ہوتی ہے کہ سچ کیا ہے؟ اس کی کون کون سی شکلیں ہیں؟ وجود کی فطرت کیا ہے۔دنیا صرف ایک ہے یا اور بھی دنیا ہیں؟ حقائق کیا ہیں؟ مقاصد کیا ہیں؟ بدلاؤ کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ میرا وجود کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ یہ دنیا کیا ہے؟ جنت کیا ہے؟ آخرت کیا ہے؟ ان تمام سوالوں سے تعلیم کے مقاصد اور مثالی اصول قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ہم انسان کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ اس کے

اخلاق واقدار کو کس طرح فروغ دیا جاسکتا ہے؟ ان سارے سوالوں کے جواب اس میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ اور تعلیم ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں مدد کرتی ہے۔

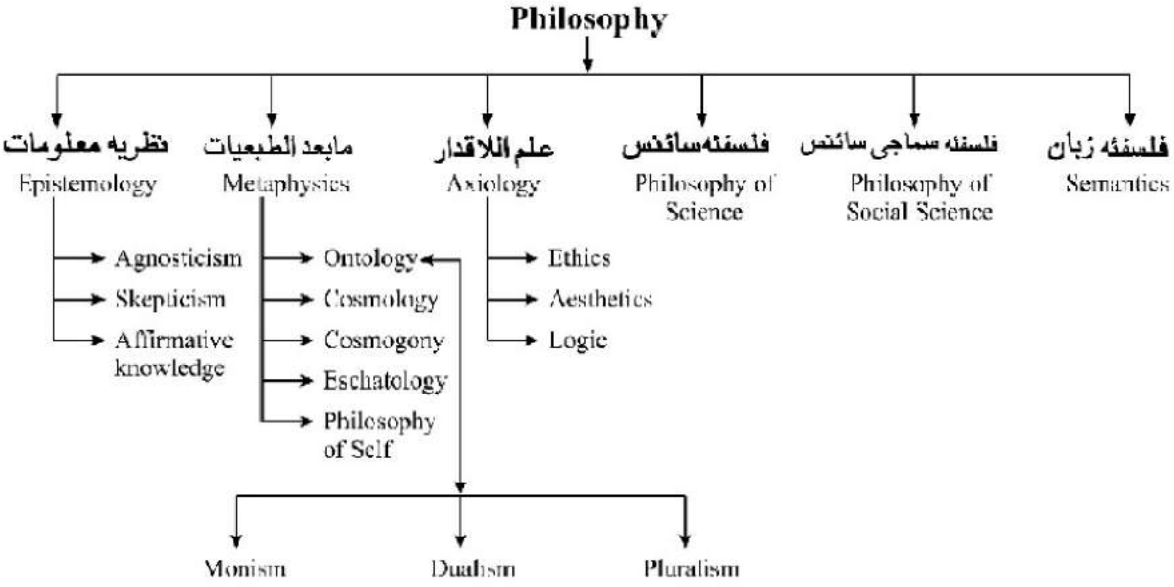

علم الاقدار(Axiology): اس میں تین شاخیں ہیں۔ اخلاقیات(Ethics)، جمالیات(Aesthetics) اور منطق(Logic)

اخلاقیات(Ethics): انگریزی لفظ Ethics، Ethos سے بنا ہے جس کے معنی کردار ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں کردار، عادات اور برتاؤ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل انسانی برتاؤ کی سائنس ہے۔ اسے اخلاقی فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں انسانی کردار اور عادتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

جمالیات(Aesthetics): یہ خوبصورتی یا جمالیات کی سائنس ہے۔ تعلیم کا مقصد طلبا کا مجموعی فروغ کرنا ہے۔ جس میں جمالیات کا فروغ بھی شامل ہے۔ یہ ادب اور فن کو فلسفیانہ انداز ادا کرتا ہے۔ اسی سے پورے ادب کا تنقیدی تجزیہ ہوتا ہے۔

منطق(Logic): لفظ منطق logic کا اردو ترجمہ ہے۔ جو لاطینی لفظ Logos سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی بحث ومباحثے کے منطقی پہلو کے ہیں۔ Dewey John کے مطابق منطق ایک علمی فکر ہے۔ اس میں Inductive اور Deductive طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے سائنسوں کی سائنس کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں غور وفکر اور دانش مندگی کے ساتھ سبھی بنیادی ثبوتوں کے تجزیے کی بنیاد پر مسائل کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کا آخری مقصد کیا ہے اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کون کون سے اقدار، روایات ضروری ہیں ان کا کیا معیار ہونا چاہیے۔ اس میں اس بات پر بھی بحث ہوتی ہے کہ اقدار کی افادیت کسی مخصوص زمانے تک محدود رہتی ہے یا ہر دور میں پائی جاتی ہے اور کیا اس میں کسی طرح کا بدلاؤ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

فلسفۂ سائنس(Philosophy of Science): اس میں سائنس سے متعلق مطالعہ کیا جاتا ہے اور تحقیقی کام کو انجام دیا جاتا ہے۔ اس میں سائنسی نظریے سے کائنات کے وجود کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ فلسفہ دنیا کے سائنسی پہلوؤں کو آشنا کرتا ہے۔

فلسفۂ سماجی علوم Philosophy of Social Science: اس میں سماجی پہلوؤں اور اس سے جڑے تمام موضوعات پر غور وخوض کیا جاتا ہے۔اس میں تاریخ، سیاسیات، جغرافیہ، سماجیات اور معاشیات وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

علم المعانی (Semantic): اس میں زبان کے متعلق مطالعہ کیا جاتا ہے۔زبان کا آغاز وارتقا کیسے ہوا؟ بولی کیا ہے؟ بولی کتنے طرح کی ہوتی ہے؟ ادب کیا ہے؟ ان سارے موضوعات کا مطالعہ اس فلسفہ زبان میں کیا جاتا ہے۔یہ زبان کا لسانی مطالعہ پیش کرتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

1- علم الاقدار کی ___________ شاخیں ہیں؟

2- علمیات میں __________ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

3- مابعدالطبیعیات میں ___________ پر بحث ہوتی ہے۔

4- فلسفۂ سائنس میں __________ سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

1.4 تعلیم کا تصور اور وسعت (Concept and Scope of Education)

تعارف:

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو نہ وہ اس وقت چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے اور نہ ہی خود کھا پی سکتا ہے۔یعنی وہ ہر کام کے لیے دوسرے پر منحصر رہتا ہے۔مگر یہی بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو کوئی حکمراں بنتا ہے تو کوئی سائنس داں بنتا ہے کوئی فلسفی تو کوئی ماہر تعلیم۔انسان کبھی جنگلوں میں رہتا تھا۔خانہ بدوش زندگی گزارتا تھا لیکن آج انسان اتنا ترقی کر گیا ہے کہ وہ چانداور مریخ پر جارہا ہے۔ذرا سوچیے یہ ساری چیزیں کیسے ممکن ہوئیں۔تو جواب ملے گا تعلیم کی بنیاد پر۔یعنی تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جسے حاصل کر کے انسان نے دنیا میں دوسری جاندار چیزوں پر برتری حاصل کی ہے اور دنیا کی ساری چیزوں پر حکومت کر رہا ہے۔تعلیم ہی انسان کی دیگر جانوروں سے الگ پہچان قائم کراتی ہے۔تعلیم کے ذریعے انسان کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔اسی کے ذریعے انسان اپنی تہذیب وثقافت کی ترسیل کرتا ہے۔تعلیم انسان کے طرز عمل میں بدلاؤ لاتی ہے۔اور جسمانی، ذہنی، دماغی، روحانی، طاقتوں کو فروغ دیتی ہے۔تعلیم انسان کے اندر اقدار پیدا کرتی ہے اور اس کی کردار سازی کرتی ہے۔اس میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور اسے سماجی میں وجود کے قابل بناتی ہے۔مختصراً کہا جائے تو تعلیم ہی انسان کو وجود بخشتی ہے۔

تعلیم کا تصور (Concept of Education)؛

فلسفی جان لاک کے مطابق ''بچہ کا دماغ ایک کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے، جس پر کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے''۔

تعلیم کا مطلب معلم کے ذریعے طلبا کو نیا علم فراہم کرنا ہے۔تعلیم کا یہ تعارف قدیم اور عہد وسطیٰ میں خاص طور پر رائج تھا مگر زیادہ تر ماہرین تعلیم نے تعلیم کو اس نظریے سے نہیں دیکھا۔تعلیم انگریزی لفظ Education کا مترادف ہے۔Education لاطینی لفظ Educo سے

بنا ہے۔اس میں دوالفاظ شامل ہیں۔’E‘ اور'Duco'۔E کا مطلب ہے’’اندر سے باہر کی طرف اور Duco کا مطلب ہے’’ آگے بڑھنا‘‘۔ اس طرح Education کے لغوی معنیٰ’’اندر سے باہر کی طرف بڑھنا‘‘ ہیں یعنی تعلیم کا مطلب انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو باہر نکالنا ہے۔تعلیم انسان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو باہر نکالنے کا ایک آلہ ہے۔

Education کو Educatum, Educare اور Educere سے بھی متعلق کر کے دیکھا جاتا ہے۔

تربیت دینا،سکھانا Educatum - to Train, act of teaching or training

اٹھانا،سیکھانا Educare to bring up, to educate, to raise

نکالنا Educere - to lead out or to draw out

Educare کا مطلب ہوتا ہے’’اندر سے باہر کی طرف گامزن ہونا اور Educare کے معنیٰ بھی آگے بڑھنا یا باہر نکالنا ہوتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم کے مندرجہ ذیل معنیٰ نکلتے ہیں۔

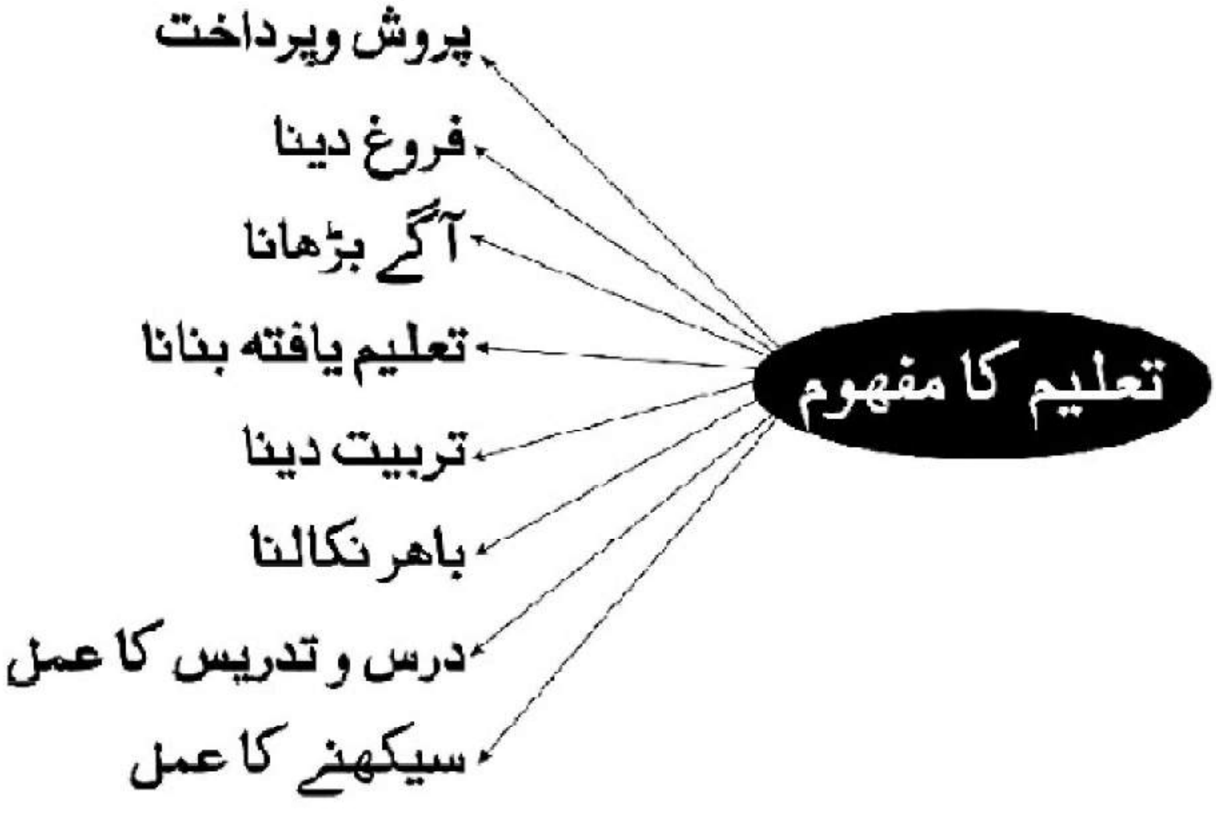

تعلیم کے لیے Pedagogy،شکشا اور ودیا جیسے الفاظ بھی ہندوستان میں رائج ہیں۔Pedagogy کا مطلب شاگرد کی رہبری کرنا، شکشا،سنسکرت لفظ شاس سے نکلا ہے۔جس کے معنیٰ ہیں بڑھانا۔قابو میں کرنا۔حکم دینا وغیرہ۔ودیا یہ لفظ وید سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ہیں جاننا۔

ان ساری باتوں پر غور کریں تو یہ معنیٰ اخذ کیے جاتے ہیں کہ تعلیم ترقی وفروغ سے متعلق ایک عمل ہے۔انسان کی ترقی اور فروغ کے لیے علم کا ہونا نہایت ضروری ہے اور تعلیم انسان یا فرد کے طرز عمل میں بدلاؤ لاتی ہے۔

تعلیم کا محدود تصور:

عام طور پر تعلیم کا استعمال دو معنٰی میں کیا جاتا ہے۔ایک محدود معنی میں اور دوسرا وسیع معنی میں۔محدود معنٰی میں تعلیم کا مطلب تعلیمی اداروں میں ہونے والی درس و تدریس ہے۔اس میں کسی طے شدہ مقام پر طے شدہ افراد کے ذریعے طے شدہ نصاب کو ایک طے شدہ ذریعے سے تدریس کی جاتی ہے۔اس میں حقیقی زندگی کی تعلیم نہ دے کر صرف ذہنی فروغ کے لیے کتابی تعلیم دی جاتی ہے۔زندگی میں اس کے علاوہ بھی انسان کو بہت کچھ جاننے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔حقیقی زندگی میں انسان کو بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے لیکن رسمی تعلیم میں طلبا کا صرف ذہنی فروغ ہوتا ہے اس میں تعلیم طالب علم مرکوز نہ ہو کر معلم مرکوز ہوتی ہے۔جس میں معلم اہم ہو جاتا ہے۔معلم طلبا کو صرف کتابی اور ذہنی علم دیتا ہے۔اس طرح کی تعلیم میں طالب علم صرف رٹنے والا طوطا بن کر رہ جاتا ہے۔اس کی مجموعی ترقی نہیں ہو پاتی۔اس طرح تعلیم' (Formal Education) رسمی تعلیم بن کر رہ جاتی ہے۔جو ایک منصوبہ بند طریقے سے چلتی رہتی ہے۔اس میں تعلیم اپنے اندر ان اثرات کو شامل نہیں کر پاتی جو کرنا چاہیے۔مختلف دانشوروں نے اس کی تعریفات اپنی زبان میں بیان کی ہیں۔

''اپنے محدود مفہوم میں تعلیم کا مطلب انسان پر ماحول کے اس اثر سے ہے جو کہ اس کے کردار، عادت، رویہ اور سوچ کے طریقے میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بنتا ہے''۔(Thompson)

"The influence of the enviromnent on the individual with a view to producing a permanent change in his habits, behaviour of thought and of attitude." (Thompson)

''اپنے محدود مفہوم میں تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس میں اور جس کے ذریعے نوجوانوں کے علم، کردار اور طرز عمل کی آرائش کی جاتی ہے اور انہیں ایک شکل دی جاتی ہے''۔(Dewey)

"Education is a process in which and by which the knowledge, character of the young are shaped, moulded"- Dewey

''اپنے محدود مفہوم میں تعلیم کا مطلب اس تہذیب سے ہے جو کہ ایک نسل اپنی آنے والی نسلوں کو اس امید پر دیتی ہے کہ یا تو وہ اس کا معیار ایسے ہی رکھیں گے یا اس میں اور اضافہ کریں گے''۔(J.S.Mill)

اس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(1) تعلیم کا مفہوم ہدایت دینا ہے۔

(2) تعلیم وہ منظّم عمل ہے جس کے ذریعے معلم' اپنے طلبا کو علم فراہم کرتا ہے۔

(3) اس کا استعمال عمل تدریس کے لیے کیا جاتا ہے۔

تعلیم کا وسیع تصور:

وسیع معنی میں تعلیم کا مطلب ان سبھی چیزوں سے ہے جن کا اثر طالب علم یا فرد پر پیدائش سے لے کر موت تک پڑتا ہے۔یعنی طالب علم یا فرد اپنے ماحول میں رہ کر آزادانہ طور پر مختلف طرح کے علم کو فروغ دیتا ہے اور اپنی نشو و نما کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں کہیں تو تعلیم تا عمر چلنے والا عمل ہے جو کسی مخصوص جگہ، وقت اور ماحول کا محتاج نہیں رہتا۔انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے اور عمل سے سیکھتا رہتا ہے۔اس میں وہ ہر انسان، استاد ہوتا ہے جس سے ہم اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

☆ تعلیم زندگی بھر چلنے والا عمل ہے۔

☆ یہ کسی جگہ ماحول یا فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔

☆ اس میں رسمی اور غیر رسمی دونوں تعلیم شامل ہیں۔

☆ انسان زندگی کا ہر تجربہ حاصل کرتا ہے۔

☆ انسان کے کردار اور طرزِ عمل میں بدلاؤ آتا ہے۔

☆ سماج میں بدلاؤ آتا ہے۔

تعلیم کے اقسام:

(1) رسمی تعلیم (Formal Education)

(2) بے رسمی تعلیم (Informal Education)

(3) غیر رسمی تعلیم (Non Formal Education)

(1) **رسمی تعلیم (Formal Education)**: جو تعلیم، تعلیمی اداروں میں دی جاتی ہے اسے رسمی تعلیم کہا جاتا ہے۔ یہ منصوبہ بند طریقے سے دی جاتی ہے اس میں تعلیم کا مقام، نصاب اور معلم سبھی پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ اس میں مخصوص کورس کی تعلیم دی جاتی ہے جس میں کتابی تعلیم شامل رہتی ہے۔ جیسے اسکول و مدرسہ کی تعلیم، کالج اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے۔ یہاں ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔

(2) **بے رسمی تعلیم (Informal Education)**: جو تعلیم گھر یا سماج سے حاصل کی جاتی ہے اسے بے رسمی تعلیم کہا جاتا ہے۔ اس میں تعلیم کے مقاصد، نصاب، مقام اور معلم کچھ بھی طے شدہ نہیں ہوتے اور یہ گود سے گور تک چلتی رہتی ہے۔ انسان ہر لمحے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے اور اپنے طرزِ عمل میں بدلاؤ لاتے رہتا ہے۔ بے رسمی تعلیم انسان کی شخصیت کی نشونما میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

(3) **غیر رسمی تعلیم (Non Formal Education)**: اس تعلیم کو رسمی اور بے رسمی کے درمیان میں رکھا جاتا ہے۔ رسمی میں سب کچھ طے شدہ ہوتا ہے جب کہ غیر رسمی میں کچھ بھی طے نہیں ہوتا مگر غیر رسمی میں کچھ چیزیں طے شدہ ہوتی ہیں اور کچھ میں لچک ہوتی ہے۔ داخلہ امتحان، نصاب، مقاصد طے شدہ ہوتے ہیں مگر پڑھنے کا طریقۂ کار اور وقت وغیرہ سیکھنے والے پر منحصر کرتا ہے جیسے فاصلاتی تعلیم۔

تعلیم کی وسعت (Scope of Education):

تعلیم کے دائرہ کار کو ہم مندرجہ ذیل طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

☆ **فلسفۂ تعلیم (Philosophy of Education)**

انسانی زندگی راز دار ہے۔ جب تک ہم انسانی زندگی کے راز کو نہ سمجھ سکتے تب تک انسانی زندگی کے مقاصد کو طے کر پانا مشکل ہے اور جب تک مقاصد طے نہیں ہو جاتے تب تک یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کیا پڑھنا ہے اور کیا پڑھانا ہے۔ یہ فلسفہ ہی ہے جو انسان اور اس کے عمل کی مکمل تفسیر بیان کرتا ہے اور اس کے مقصد کو طے کرتا ہے۔ تعلیم کو فلسفے کی مدد سے ہم تعلیم کی فطرت، ضرورت اور مقصد کو سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے

مطابق تعلیمی نصاب تیار کر سکتے ہیں۔

☆ تعلیم کی سماجیات (Sociology of Education)

انسان ایک سماجی مخلوق ہے وہ سماج میں رہتا ہے اور سماج میں رہنے والے لوگوں سے سماج کے رسم و رواج کو سیکھتا ہے۔ اس کے نظریہ وسوچ پر سماج اور سماجی اداروں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تعلیم سماج اور سماجی اداروں، سماجی گروپوں اور سماجی سرگرمیوں میں آپسی تعلق قائم کرتی ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم سماجی ترقی کی بنیاد ہے۔ تعلیم سماجی تغیر اور تبدیلی کا ذریعہ ہے۔

☆ تعلیم کی نفسیات (Phychology of Education)

موجودہ دور میں طالب علم مرکوز تعلیم رائج ہے۔ اس میں طلبا کی دلچسپی یادداشت، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، نظریات، رجحان اور سیکھنے کی صلاحیتوں پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔ اس کے سیکھنے، پڑھنے کے حالات و ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی کے مطابق نصاب کی تشکیل دی جاتی ہے۔ اس میں طالب علم کو اہمیت دی جاتی ہے اور اسی کو مرکز مان کر تعلیمی نظام قائم کیا جاتا ہے۔

☆ تعلیم کی تاریخ (History of Education)

اس میں تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مختلف ادوار میں تعلیم کا کس طرح فروغ ہوا، سماجی ضرورت کے مطابق تعلیم میں کس طرح کی تبدیلیاں آئیں اور اس نے سماجی ضرورتوں کو کس طرح پورا کیا۔ ان ساری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

☆ تقابلی تعلیم (Comparative Education)

تقابلی تعلیم کے ذریعے مختلف ملکوں کے تعلیمی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف ممالک میں تعلیم کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کے مضامین کیا ہیں۔ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کس طرح نصاب و نظام بنایا گیا ہے ان چیزوں کو سمجھ کر ہم اپنے تعلیمی نظام میں مناسب تبدیلی کر سکتے ہیں تاکہ ہمارا معیار تعلیم بلند ہو۔

☆ تعلیم کا انتظام وانصرام (Management and Administration of Education)

اس میں تعلیمی اداروں کے انتظام وانصرام کے بارے میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت تعلیمی اداروں کے نظام کو کس طرح منظم کرے گی، نصاب کیا ہوگا۔ بنیادی سہولتیں کون کون سی ہوں گی انہیں کس طرح مہیا کرایا جائے۔ امتحان کا کیا طریقہ ہوگا وغیرہ ان ساری باتوں کا اس میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔

☆ تعلیم کی تکنالوجی (Technology of Education)

تعلیم کے دائرہ کار میں تکنیکی تعلیم کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ پڑھنا اور سیکھنا دونوں درس و تدریس کا عمل ہے۔ سیکھنا کیا ہے؟ سیکھنے کا مؤثر طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ درس و تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے کون کون سی تکنیک استعمال ہونی چاہیے۔ ان ساری باتوں کا مطالعہ ہم اس مضمون میں کرتے ہیں۔ نئی ایجاد کردہ ٹکنالوجی کا استعمال درس و تدریس میں کس طرح کیا جائے۔ طلبا اپنے علمی و ذہنی فروغ میں ٹکنالوجی کا استعمال کیسے اور کس طرح کر سکتے ہیں۔ ان کی رسائی آسانی سے ٹکنالوجی تک کیسے ہو، ان سارے پہلوؤں پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔

☆ تعلیم کے دیگر دائرے:

تعلیم کے میدان میں روز بروز نئے نئے مضمون فروغ پا رہے ہیں اور سماج کی ضرورتوں کے مطابق ان کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

جیسے تعلیم اطفال، تعلیم نسواں، بنیادی تعلیم، تعلیم اساتذہ، ماحولیاتی تعلیم، شمولیاتی تعلیم، اقلیتی تعلیم وغیرہ۔

اپنی معلومات کی جانچ

1 تعلیم کسے کہتے ہیں؟
2 تعلیم کے محدود اور وسیع معنیٰ کیا ہیں؟
3 تعلیم کے اقسام (دائرے) کون کون سے ہیں؟
4 تعلیم کا دائرہ کار کیا ہے؟
5 تعلیم کے مفہوم کو واضح کریں۔
6 تعلیم کے محدود اور وسیع معنی کو لکھیں۔
7 تعلیم کے کون کون سے اقسام ہیں۔ بتائیں۔
8 تعلیم کے دائرہ کار کو لکھیں۔

1.5 فلسفہ اور تعلیم کا تعلق (Relationship between Philosophy and Education)

فلسفہ اور تعلیم میں بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یہ ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ فلسفہ جہاں انسان کے وجود کو قائم کرتا ہے وہیں تعلیم ان کے باریک پہلوؤں اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ فلسفہ انسانی زندگی کے مقاصد کو طے کرتا ہے جب کہ تعلیم ان مقاصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں کا مقصد انسان کو سچائی سے آشنا کرانا اور اس کی زندگی کو ترقی وفروغ دینا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فلسفہ اور تعلیم باہمی طور پر مربوط ہیں۔ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل نکات سے کی جاسکتی ہے۔

☆ فلسفہ اور تعلیم میں باہمی تعلق ہے۔
☆ فلسفہ تعلیم پر منحصر ہے۔
☆ تعلیم فلسفہ پر منحصر ہے۔
☆ تعلیم فلسفہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
☆ تعلیم فلسفہ کا متحرک پہلو ہے۔
☆ فلسفہ کے بغیر تعلیم پر غور نہیں کیا جاسکتا۔
☆ فلسفہ تعلیم کی حقیقی منزل طے کرتا ہے۔

فلسفہ اور تعلیم میں باہمی تعلق ہے:

فلسفہ اصول ہے اور تعلیم اس کی عملی شکل۔ اصول عمل کی طرف زور دیتا ہے اور عمل اصول میں ترمیم کرتا ہے۔ فلسفہ نظریہ پیش کرتا ہے اور تعلیم اس کا استعمال کرتی ہے۔ فلسفہ تعلیم کا اصول ہے اور تعلیم عملی فلسفہ ہے۔ فلسفہ درس وتدریس کی شکل میں آتا ہے اور درس وتدریس کی بنیاد

فلسفے پر ہوتی ہے۔تعلیم پودا ہے اور فلسفہ اس کا پھول۔فلسفے کے بغیر درس وتدریس کے معنیٰ بیکار ہیں۔فلسفے کے بغیر تعلیم کا تصور ممکن نہیں اور فلسفہ کو تعلیم کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔اس طرح ہم غور کریں تو فلسفے کے بغیر تعلیم کا کوئی وجود نہیں اور تعلیم کے بغیر فلسفہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔اس طرح دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔

راس (Ross) کے مطابق۔''فلسفہ اور تعلیم ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ایک ہی چیز کے مختلف تناظر پیش کرتے ہیں۔ایک دوسرے کو تقویت بخشتے ہیں۔پہلا فکری پہلو ہے اور دوسرا سرگرم وفعالی پہلو ہے''۔

"Philosophy and Education are like two sides of the same coin, presents different views of same thing"- J.S. Ross

جان ڈیوی (Dewey John) راس کے خیالوں کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ''عمومی حالات میں فلسفہ تعلیم کا اصول ہے''

(Philosophy is the theory of education in its most general phases)

جان ایڈم (Adam John) کا ماننا ہے کہ''تعلیم فلسفہ کا متحرک پہلو ہے''۔

(Education is the dynamic side of Philosophy)

فلسفہ تعلیم پر منحصر ہے:

فلسفہ تعلیم کی پیروی کرتا ہے۔اس نظریے سے فلسفہ تعلیم پر منحصر ہے۔ہر فلسفی اپنے فلسفے کو تعلیم کے ذریعے پیش کرتا ہے اس لیے تعلیم فلسفے کی پیدائش کی بنیاد رکھتی ہے۔ایک تعلیم یافتہ انسان ہی منظّم طریقے کے مطابق غور وفکر کرسکتا ہے اور اپنی باتوں کو منطقی انداز میں رکھ سکتا ہے۔تعلیم فلسفے کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے میں مدد کرتی ہے۔درسی کتاب، جرنلس، میگزین، معلم وغیرہ فلسفے کی اشاعت وتبلیغ کے اہم وسائل ہیں۔تعلیم کے ذریعے ہی فلسفہ میں آنے والے چیلنج ومسائل کا حل نکالا جاتا ہے۔فلسفہ کے نئے نئے موضوعات پر تحقیق تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔اس طرح تعلیم کے بغیر فلسفہ کا فروغ وترقی ناممکن ہے۔

تعلیم فلسفہ پر منحصر ہے:

Fichte نے کہا کہ''تعلیم کا فن فلسفے کے بغیر کبھی مکمل وضاحت حاصل نہیں کرسکتا''۔

(The art of education will never attain complete clearness in itself without philosophy)

Spencer نے کہا کہ''سچی تعلیم کو صرف سچا فلسفہ ہی عملی شکل دے سکتا ہے''۔

"True Education is practicable only to true philosophies"- Spencer

Ross کا خیال ہے کہ''تعلیم کے متعلق سبھی سوال آخرکار فلسفہ کے ہی سوال ہوتے ہیں''۔

"All Educational questions are ultimately the questions of philosophy"

Gentile کہتا ہے کہ فلسفہ کے بغیر تعلیم کی حقیقی فطرت کا فہم نہیں ہوسکتا''۔

"Education without philosophy would mean a failure to understand the precise nature of Education"- Gentile

ان سبھی خیالات پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تعلیم فلسفہ پر منحصر ہے۔بغیر فلسفہ کے تعلیم کے مقاصد کو طے کر پانا مشکل ہے۔فلسفہ ہی تعلیم کو سمت عطا کرتا ہے۔فلسفہ ہی تعلیم کو وجودیت بخشتا ہے۔اگر فلسفہ نہ ہو تو تعلیم کے کوئی معنیٰ نہیں رہ جاتے ہیں۔تعلیم کے لیے مضمون،اس کی فطرت،مواد،مقاصد،یہ سبھی فلسفہ کے ذریعے طے ہوتے ہیں۔تعلیم فلسفہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔پہلے کہا جا چکا ہے کہ فلسفہ مقصد ہے اور تعلیم اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔فلسفہ اقدار،اصول اور نظریات پیش کرتا ہے اور تعلیم انہیں عملی شکل دیتی ہے۔

Herbert کے مطابق۔''تعلیم تب تک آرام نہیں کر سکتی جب تک فلسفیانہ سوال مکمل طور پر حل نہیں ہو جاتے۔''

کبھی کبھی ماہر تعلیم فلسفیوں کے سامنے ایسے سوال کھڑا کرتے ہیں جن کا پہلے سے طے حل بیکار ثابت ہوتا ہے اور یہی حالات نئی سوچ نئے نئے نظریات پیدا کرتے ہیں اور فلسفہ کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔

تعلیم فلسفہ کا متحرک پہلو ہے (Education is the dynamic side of Philosophy)

سماج میں دو پہلو دیکھے جاتے ہیں پہلا اصولی دوسرا عملی۔فلسفہ اصولی پہلو ہے اور تعلیم عملی پہلو۔فلسفہ انسانی زندگی کے مقاصد کو طے کرتا ہے اور ان کو حاصل کرنے کے اصول بناتا ہے۔تعلیم ان اصولوں کو عملی جامہ پہناتی ہے اور انسان کے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرتی ہے تب جا کر سماج اپنے مقاصد کو حاصل کر پاتا ہے۔Adam نے ٹھیک ہی کہا ہے:

فلسفہ کے بغیر تعلیم پر غور نہیں کیا جا سکتا:

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ فلسفہ اصول ہے اور تعلیم عملی پہلو۔اصول بغیر عمل کے بھی رہ سکتا ہے۔مگر عمل بغیر اصول کے ناممکن ہے۔اس لیے فلسفے کی حیثیت آزاد ہے جب کہ تعلیم کی نہیں۔فلسفہ معلم کو علم و نظریہ عطا کرتا ہے جس سے وہ سبھی مشکلوں کا حل نکالنے میں مدد حاصل کرتا ہے۔فلسفہ تعلیم کو قوت عطا کرتا ہے۔جس سے وہ آگے بڑھ کر سماج کو روشنی دے سکے۔اگر فلسفہ جسم ہے تو تعلیم اس کی روح ہے۔یعنی تعلیم کے سبھی پہلوؤں پر فلسفے کا قبضہ ہے۔

فلسفہ تعلیم کی حقیقی منزل طے کرتا ہے:

تعلیم کو فلسفے کے ذریعے طے کردہ منزل کی طرف جانا ہوتا ہے۔Rusk نے ٹھیک کہا ہے کہ''فلسفہ زندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کا مشورہ پیش کرتا ہے''۔فلسفہ نظریے کو پیش کرتا ہے اور تعلیم اس نظریے کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتی ہے۔اس کے لیے درس و تدریس کو ذریعہ بناتی ہے۔

"Philosophy formulates what it conceives to be the end of life"- Rusk

تعلیم فلسفہ کو زندہ رکھتی ہے:

فلسفہ میں جتنے بھی اصول بنائے جاتے ہیں اور جتنے بھی نظریات پیش کیے جاتے ہیں ان سب کا تحفظ تعلیم کرتی ہے اور سارے اصولوں و نظریات کو ایک دوسرے تک منتقل کرتی ہے جس سے وہ زندہ رہتی ہے۔اگر آج ہم فلسفے کے جو نظریاتی اصولوں کو جان اور سمجھ پا رہے ہیں تو وہ تعلیم سے ہی ممکن ہو پایا ہے۔

تعلیم فلسفے کو نئے نئے موضوعات سے آشنا کراتی ہے۔فلسفے میں پیش کردہ اصول و نظریات پر بحث و مباحثہ تعلیم کے ذریعے ہی ممکن

ہوتا ہے اور پھر ان پر بحث ومباحثے سے نئے نئے موضوع ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس سے علم کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

فلسفی تعلیم داں بھی ہوتے ہیں:

زمانہ قدیم سے حال تک کی تاریخ پر غور کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی عظیم فلسفی ہوئے ہیں وہ بہترین معلم بھی تھے۔ جیسے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، فروبل، گاندھی، ٹیگور وغیرہ۔ ان کے ذریعے پیش کردہ فلسفے پر لکھی گئی کتابیں ہر زمانے میں لوگوں کی تعلیمی رہنمائی کرتی ہیں۔ اور روشنی بخشی ہے۔ ہر دور میں لوگ ان کی باتوں سے استفادہ حاصل کرتے آئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

1. تعلیم فلسفہ کا__________پہلو ہے۔
2. فلسفہ تعلیم کے____________کو طے کرتا ہے۔
3. ہر فلسفی اپنے فلسفہ کو___________کے ذریعے پیش کرتا ہے۔
4. راس کہتا ہے کہ " تعلیم____________"۔
5. Rusk کے مطابق فلسفہ_______________۔

1.6 فلسفہ اور تعلیم کے مقاصد (Philosophy and Aims of Education)

ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح تعلیم کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ تعلیم کا ہر مقصد زندگی کے مقاصد پر منحصر ہوتا ہے اور زندگی کا مقصد اپنے وقت کے فلسفے سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیم کے مقصد کی تشکیل، زندگی کے مقصد کے مطابق کی جاتی ہے۔ چوں کہ زندگی کے مقاصد اپنے وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اس لیے تعلیم کے مقاصد بھی بدلتے رہتے ہیں کیوں کہ زندگی کا جو مقصد ہوتا ہے وہی تعلیم کا مقصد ہوتا ہے۔ چوں کہ زندگی کے مقاصد کا تعین فلسفی کرتے ہیں اس لیے مختلف فلسفوں کے نظریات، زندگی کے مقاصد کو متعین کرتے ہیں اور زندگی کے مقاصد تعلیم کے مقاصد کو متعین کرتے ہیں۔ اس لیے جیسے جیسے زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اس طرح تعلیم کے مقاصد میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے جب جب دنیا میں تبدیلی آئی لوگوں کی زندگی میں بھی تبدیلی آئی اور اس سے متاثر ہو کر تعلیم کے مقاصد بھی زمانے کے ساتھ بدلتے رہے۔

تعلیم کے مقاصد کو ہم مندرجہ ذیل طریقوں سے سمجھ سکتے ہیں۔

عہد قدیم:

جب قدیم اسپارٹا، روم اور ہندوستان کی تعلیم کے مقاصد کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ملک نے اپنی ضرورت کے مطابق علم کے مقاصد طے کیے۔ اسپارٹا میں لوگوں کو ملک سے محبت، ہمت اور حکم کی تعمیل جیسے جذبات کو فروغ دینا تھا تو وہاں دوڑنے، کھیلنے، لڑنے کی تعلیم و ترتیت دی جاتی تھی۔ اسی طرح روم کی جب ہم بات کرتے ہیں تو وہاں کے شہری اپنی زندگی میں حقوق وفرائض پر زیادہ زور دیتے تھے اس لیے

انہیں اس طرح کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے قدیم ہندوستان میں مذہب کا بول بالا تھا۔ زندگی کا مقصد خدا کو پہچاننا، کردار سازی کرنا، اقدار کو فروغ دینا، سماجی ذمہ داریوں کا احساس وغیرہ دلانا تھا۔ اس لیے تعلیم کا نظام بھی اسی مطابق طے کیا گیا تھا۔ لوگوں کو مذہبی تعلیم زیادہ دی جاتی تھی اس لیے تعلیمی نظام بھی اسی کے مطابق تشکیل دیا گیا تھا۔ گروکل اور بودھ وہیار میں مذہبی، اخلاقی اور اقداری تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔

عہد وسطیٰ:

عہد وسطیٰ آتے آتے زمانے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس زمانے میں زندگی کے مقاصد بدل چکے تھے۔ اس لحاظ سے زندگی کے فلسفے میں بہت تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس لیے تعلیم کے مقاصد میں بھی نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت دنیا میں عیسائی مذہب کا بول بالا تھا۔ تعلیم میں مذہب کی شمولیت دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں تعلیم کا مقصد مذہبی زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک ہندوستان کی بات ہے۔ یہاں یہ دور مسلم حکمرانوں کا دور تھا۔ اس لیے اسے مسلم دور کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ قدیم ہند کی طرح یہاں بھی مذہبی فلسفہ تعلیم کا اہم مقصد تھا۔ تعلیم کے ذریعے اسلام کی تبلیغ، کردار سازی، اقدار کا فروغ وغیرہ اہم مقاصد رہے۔ مکتب و مدرسوں میں مذہبی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ طلبا کی کردار سازی اور اقدار کا فروغ تعلیم کا اہم مقصد تھا۔

عہد جدید:

اس عہد میں کافی تغیر دکھائی دیتا ہے۔ لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، سوچنے سمجھنے کے نظریے وغیرہ میں کافی تبدیلی نظر آتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کے میدان میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ چوں کہ زندگی کے فلسفے میں کافی تبدیلی آئی ہے اس لیے تعلیم میں بھی کافی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لوک (Locke) اور روسو (Rousseau) جیسے فلسفیوں نے قدیم نظریات کی مخالفت کی اور پرانے روایتی تعلیمی نظام پر سخت تنقید کی۔ اس بات پر زور دیا کہ بچوں کی بنیادی صلاحیتوں کو آزادانہ طور پر فروغ پانے دیا جائے۔ اسی سے تعلیمی نفسیات کا جنم ہوا۔ جیسے جیسے تعلیم میں نفسیات کا رول بڑھتا گیا تعلیم طالب علم مرکوز ہوتی گئی۔ آگے چل کر پسٹالوزی (Pestalozzi) نے تعلیم کا مقصد بچوں کی شخصیت کا فروغ بتایا اور ہربارٹ (Herbert Spencer) نے تعلیم کا مقصد طلبا کی کردار سازی بتایا۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا میں سیاسی، معاشی و سماجی طور پر کافی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ مختلف ممالک خاص طور پر ترقی یافتہ ملکوں نے الگ الگ نظریات کو اپنایا۔ امریکہ نے جہاں جمہوریت کو فروغ دیا، وہیں روس اور چین نے مارکسزم کو فروغ دیا۔ اس طرح مختلف ملکوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مختلف فلسفیانہ نظریات اپنائے اور اس کے پیش نظر تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا تا کہ وہ اپنے اپنے نظریات کو فروغ دے سکیں۔ 1947ء میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے ملک میں سماج وادی اور جمہوری نظریے کو اپنایا گیا جس کا مقصد ایک اچھا شہری بنانا اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔

1.6.1 فلسفہ اور نصاب تعلیم (Philosophy and Education Syllabus)

نصاب کا متعین کرنا اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ نصاب بنانے والے کس نظریے یا فلسفے کے ماننے والے یا پیروکار ہیں۔ کسی بھی ملک کے نصاب پر اس ملک میں رہنے والے لوگوں اور حکومت کے نظریات، ان کے مقاصد اور روایات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ملک کی ضرورت اور ترقی کے مطابق ہی کوئی بھی ملک نصاب تیار کرتا ہے۔ نصاب لوگوں کے نظریے میں وسعت اور تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ کسی بھی ملک کے نصاب میں

وہاں رائج نظریے کے مطابق ہی مضامین شامل ہوتے ہیں۔

1.6.2 فلسفہ اور طریقۂ تدریس(Philosophy and Teaching Techniques)

فلسفہ اور طریقۂ تدریس کے درمیان بہت ہی گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت بوقت بدلتے ہوئے فلسفی نظریے کے مطابق طریقہ ہائے درس وتدریس میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کوئی ملک یا سماج اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو بھی طریقۂ تدریس عمل میں لاتا ہے اس پر فلسفے کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح فلسفیانہ ماحول میں درس وتدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے اسی طرح فلسفیانہ نظریے کا اثر طریقۂ تدریس پر پڑتا ہے۔ اگر فلسفہ فطریت کے تحت درس وتدریس پر غور کیا جائے تو یہاں نصاب سے زیادہ طالب علم پر زور دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں طلبا مرکوز طریقۂ تدریس کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح دیگر فلسفوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس فلسفے میں جس نظریے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے طریقۂ تدریس پر اسی کے مطابق اثر دکھائی دیتا ہے۔

1.6.3 فلسفہ اور نظم وضبط(Philosophy and Administration)

نظم وضبط پر فلسفے کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ تعلیمی ماحول میں نظم وضبط سخت ہونا چاہیے یا لچکدار یا پھر آزادانہ ماحول میں تعلیمی خدمات انجام دینا چاہیے یہ اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ ہم کس فلسفیانہ نظریے کے تحت تعلیمی خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر فلسفہ تصوریت، نظم وضبط پر زیادہ زور دیتا ہے وہیں فلسفہ فطریت نظم وضبط سے آزادی کی بات کرتا ہے۔

Adams نے اپنی کتاب Modern Development in Educational Practice میں نظم وضبط کی تین شکلیں بتائی ہے۔

(1) تکراری نظم وضبط (Repressionistic Discipline)

(2) تاثری نظم وضبط (Impressionistic Discipline)

(3) آزادی نظم وضبط (Emancipationistic Discipline)

(1) تکراری نظم وضبط(Repressionistic Discipline): اس نظریے کے تحت آزادی پر سخت پابندی کی بات کہی گئی ہے۔ اس میں طلبا کو کسی طرح کی آزادی نہیں دی جاتی بلکہ ان کو طاقت کے ساتھ سختی سے قابو میں کیا جاتا ہے۔ اس میں طلبا کے اندر ڈر اور خوف پیدا کیا جاتا ہے۔ انہیں مارا جاتا ہے۔ جسمانی تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ ان پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے یعنی ہر طرح کی آزادی سے وہ محروم رہتے ہیں۔

(2) تاثری نظم وضبط(DisciplineImpressionistic): یہ تصوریت سے متاثر ہے اس کے ماننے والوں کا اعتماد ہے کہ طلبا پر معلم کی شخصیت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے یہ مثالی معلم کی وکالت کرتا ہے تاکہ معلم کی مثالی زندگی اور شخصیت کے زیر اثر طلبا میں کردار سازی اور نظم وضبط کا بہترین فروغ ہو سکے۔ ڈر یا خوف کا ماحول نہ ہو بلکہ معلم اپنے کردار و شخصیت سے طلبا کے کردار کو متاثر کرے۔

(3) **آزادی نظم وضبط (Emancipationistic Discipline):** اس پر فطریت کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ طلبا کی مکمل آزادی کی بات کرتا ہے۔اس کا ماننا ہے کہ اگر طلبا کو آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے تو اس سے ان کی شخصیت کا فروغ آزادانہ اور فطریت کے طریقے سے ہوگا۔ ڈر یا خوف سے طلبا کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے جس سے ان کی شخصیت کا فروغ فطری طور سے نہیں ہو پاتا اس لیے انہیں آزادانہ ماحول دیا جائے تا کہ فطری ماحول میں اپنی شخصیت کو فروغ دے پائے۔

1.6.4 فلسفہ اور درسی کتابیں (Philosphy and Syllabus Books)

تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے میں درسی کتابیں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ کسی بھی ملک میں درسی کتاب میں ایسے مضامین کو شامل کیا جاتا ہے جو اس ملک و سماج کے مقاصد کو حاصل کرنے میں مددگار ہوں۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی ملک کے مقاصد و نظریے کو فلسفہ متاثر کرتا ہے۔ اس لیے فلسفے کا اثر درسی کتاب پر بھی پڑتا ہے۔

1.6.5 فلسفہ اور معلم (Philosophy and Teacher)

فلسفہ اور معلم کے درمیان رشتہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو ہر معلم فلسفی ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر معلم کا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اصول ہوتے ہیں جس پر وہ اپنی زندگی گزارتا ہے اور اسی نظریے اور عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے درس و تدریس کا کام کرتا ہے۔ کمرہ ٔ جماعت میں درس و تدریس کے درمیان انہی اصولوں اور نظریوں پر وہ روشنی ڈالتا ہے جس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے طریقۂ تدریس پر اس کی فلسفیانہ سوچ صاف صاف نظر آتی ہے اور وہ طلبا میں اپنی فلسفیانہ نظریے کی چھاپ چھوڑتا ہے۔ چوں کہ تعلیم کے میدان میں معلم کا رول اہم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے فلسفیانہ نظریات کا اثر پورے تعلیمی نظام پر پڑتا ہے۔ معلم کا رول سماج میں بھی اہم ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کو تعلیم و تربیت دیتا ہے۔ اس لیے سماج میں وہی فلسفہ رائج ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ سماج کے فلسفیانہ نظریات اسی طرح کے ہوتے جس طرح کے معلم کے نظریات ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ نظریات کی تبدیلی میں بھی معلم کا رول اہم ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کانٹ، روسو، ٹیگور اور علامہ اقبال جو عظیم فلسفی و معلم تھے اور ان سب نے اپنے فلسفیانہ نظریہ اور سوچ سے سماج میں انقلاب برپا کیا۔

1.7 فلسفۂ تعلیم اور تعلیمی فلسفہ (Philosophy of Education and Educational Philosopy)

1.7.1 فلسفۂ تعلیم (Philosophy of Education)

دنیا کے مختلف فلسفیوں نے کائنات کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں اور انہیں نظریات پر انسانی زندگی کے مقاصد کا تعین کیا ہے۔ فلسفہ انہیں نظریات کی وضاحت کرنے اور تعلیم انہیں عملی شکل دینے میں مدد کرتی ہے۔ دنیا کے مختلف فلسفیوں نے اپنے اپنے فلسفیانہ نظریات کے مطابق انسانی زندگی کے مقاصد کو طے کیا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں تعلیم زندگی کے مقاصد کی حصولیابی کرتی ہے۔ جب فلسفیانہ نظریات کی بنیاد پر مقاصد الگ الگ ہوں گے تو ظاہری بات ہے ان مقاصد کی حصولیابی کے لیے تعلیمی نظام بھی الگ الگ ہوں گے۔ یہی تعلیمی نظام فلسفہ تعلیم کو وجود بخشتا ہے اور اسے ایک الگ شاخ کے طور پر عمل میں لاتا ہے۔ جب جب ماہرینِ تعلیم، تعلیم کے مسائل میں الجھ کر اس کا حل

تلاش کرتے ہیں تو فلسفہ تعلیم انہیں مدد کرتا ہے اور راہ دکھاتا ہے۔جس کے نتیجے میں فلسفہ تعلیم کا فروغ اور نشوونما ہوتا ہے۔اس طرح یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ فلسفہ تعلیم ایک ایسا شعبہ یا شاخ ہے جہاں فلسفی اور ماہر تعلیم مل کر کام کرتے ہیں اور اسے فروغ بخشتے ہیں۔فلسفہ تعلیم میں تعلیم کے متعلق مسائل کو فلسفیانہ نظریہ اور فلسفیانہ طریقہ کار سے حل کرنے کا عمل شامل ہے۔تعلیم کے متعلق کئی مسائل ہوسکتے ہیں جیسے تعلیم کا مقصد کیا ہے؟تعلیم اور سماج میں کیا رشتہ ہے؟ تعلیمی عمل میں اسکول کا کیا مقام ہے؟تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کون کون سے طریقے اپنائے جائیں وغیرہ۔ان سوالوں کے جواب کے لیے فلسفہ تعلیم میں فلسفیانہ طریقے اپنائے جاتے ہیں اور ان کا حل نکالا جاتا ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے تجزیاتی (Analysis) اور ترکیبی (Synthesis) نظریہ اختیار کیا جاتا ہے۔ساتھ ہی استقرائی (Inductive) و استخراجی (Deductive) طریقوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔مگر فلسفہ تعلیم کا اخذ کردہ نتیجہ حرفِ آخر ہو یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہر ایک ملک میں موجودہ حالات اور وقت کی نزاکت کی روشنی میں فلسفی تعلیمی مسائل پر غور وخوص کرتے ہیں اور مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔بدلتے زمانے کے حالات وضرورت کے مطابق ان میں تبدیلی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

نوٹ: اپنے جوابات پر صحیح یا غلط کا نشان لگائیے۔

1. فلسفہ اور معلم کے درمیان بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ( )
2. فلسفی اپنے نظریات سے سماج میں تبدیلی لاسکتا ہے۔ ( )
3. فلسفہ تعلیم کے دو اہم طریقے ہیں۔ ( )
4. فلسفہ ماہرینِ تعلیم کو مسائل حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ( )

1.7.2 تعلیمی فلسفہ (Educational Philosophy)

L.K.Joad نے تعلیمی فلسفے کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تعلیمی فلسفہ تعلیم کے ''کیا'' اور ''کیوں'' پہلوؤں کا تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو تعلیمی فلسفہ تعلیم کی شکل میں ایک ایسے عمل کا تعارف کرتا ہے جس کی پیروی کی جانی چاہیے۔تعلیم کو سمجھنے کے لیے تعلیمی فلسفے میں دو طرح کے نظریات پیش کیے جاتے ہیں۔

(1) تعلیم کا عمومی نظریہ:

اس میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ تعلیم کو کیا کرنا چاہیے؟ سماج میں اس کا کیا رول ہے؟ سماجی مسائل کو حل کرنے میں تعلیم کا کیا رول ہونا چاہیے؟

(2) خصوصی نظریہ:

اس میں اس بات پر بحث کی جاتی ہے کہ تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے میں تعلیمی عمل کو کس طرح استعمال کیا جائے۔

تعلیمی فلسفہ اور طلبا (Educational Philosophy and Students):اس میں تعلیم کس کو دی جانی چاہیے؟ کیا تعلیم سب کے لیے ہونی چاہیے؟ اگر ہاں تو کیوں؟ کیا تعلیم انہیں افراد کو دی جانی چاہیے جنہیں سماج اس کے لائق سمجھتا ہے؟ تعلیمی فلسفہ ان سوالوں کا جواب دیتا ہے اور فلسفی ان سوالوں کا تجزیہ کر کے اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے اور ان ہی بنیادوں پر طلبا کے تصور کو قائم کیا جاتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ اور معلم (Educational Philosophy and Teacher):تعلیمی فلسفہ میں مثالی معلم کی بات کی جاتی ہے۔یعنی معلم کے اندر صلاحیت، مہارت، اخلاقی اقدار وغیرہ کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔معلم اور طلبا کے آپسی تعلقات معلم کی ذمہ داریوں اور ان کے پورا کرنے کے طریقوں کو بتایا جاتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ اور مواد علم: (Educational Philosophy and Content Knowledge):تعلیمی فلسفہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح کا مضمون پڑھایا جانا چاہیے اس کا مواد کیا ہونا چاہیے تاکہ بچوں کی صلاحیتوں، مہارتوں اور قدروں کو فروغ مل سکے۔

تعلیمی فلسفہ اور درس و تدریس: (Educational Philosophy and Teaching-Learning):یہ درس و تدریس کے طریقے کا تعین کرتا ہے تاکہ طلبا کو صحیح طور پر علم فراہم کیا جا سکے۔اس میں تدریسی طریقے اور تدریسی تکنیک کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ بچوں میں صلاحیتوں، مہارتوں اور قدروں کا فروغ صحیح طور پر ہو جائے۔

تعلیمی فلسفہ اور نظم وضبط: (Educational Philosophy and Discipline):اس میں نظم وضبط پر بات کی جاتی ہے کہ کس طرح طلبا میں نظم وضبط قائم کیا جا سکتا ہے۔اس کے طریقے کون کون سے ہو سکتے ہیں اس کی وضاحت بھی کی جا سکتی ہے۔

تعلیمی فلسفہ اور اداروں کی منصوبہ بندی: (Educational Philosophy and Institutional Planning):تعلیمی فلسفہ ادارے کی منصوبہ بندی، اس کے دائرہ کار اور اس کی نوعیت وغیرہ کا مطالعہ کرتا ہے۔یہ اس بات پر بھی غور کرتا ہے کہ اداروں کی منصوبہ بندی تعلیم کے مقاصد کو کس حد تک پورا کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔

تعلیمی فلسفہ میں انعام وسزا: (Educatinoal Philosophy and Reward and Punishment):تعلیم میں انعام وسزا کیا ہے۔اس کو کس حد تک استعمال کیا جانا چاہیے اور اس کے استعمال سے کیا کیا فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ اور آزادی (Educational Philosophy and Freedom):تعلیم میں آزادی کا مطلب کیا ہے یہ اس تصورِ آزادی کو تعلیم میں کس طرح روبۂ عمل لایا جانا چاہیے۔اس کی نوعیت کیا ہونی چاہیے وغیرہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ مختلف تعلیمی نظریات کے ذریعے ان سوالوں کا جواب دیتا ہے۔تعلیم کے مختلف مسائل کا تجزیاتی مطالعہ کر کے تعلیم کے اصول کی تشکیل کرتا ہے جو تعلیمی عمل کو سمت عطا کرتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ کی نوعیت (Nature of Educational Philosophy)

تعلیمی فلسفہ اور فلسفہ تعلیم میں پہلا سائنسی اور دوسرا فلسفیانہ ہے۔بہت سے فلسفی اس فرق کو بھول کر فلسفہ تعلیم کو تعلیمی فلسفے کے اصول مان لیتے ہیں۔فلسفۂ تعلیم کی نوعیت فلسفیانہ ہے اس فلسفیانہ نوعیت کو سمجھنے کے لیے فلسفیانہ مسائل، فلسفیانہ نظریہ اور فلسفیانہ طریقے کو جاننا ضروری ہے۔Brubacher نے تعلیمی فلسفے کے تین افعال بتائے ہیں۔

1۔تخمینی نوعیت (Speculative Nature):فلسفہ تعلیم عالمی فلسفے میں انسان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔تعلیم کے دائرے میں مختلف علوم کے مسائل ونتائج کو منظّم کر کے اس طرح پیش کرتا ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟

2۔معیاری نوعیت (Normative Nature) : تعلیمی عمل کے مقاصد معیارات کا تعین کرتے ہیں۔فلسفہ میں حقائق اور اقدار کا میل کیا جاتا ہے۔ جہاں حقائق کا علم مختلف سائنسوں سے ملتا ہے۔ وہاں اقدار فلسفہ کے دائرہ میں آتے ہیں۔اس طرح تعلیم میں کون کون سے اقدار کو حاصل کیا جائے گا اس کا جواب فلسفہ تعلیم دیتا ہے۔Normative کے طور پر مختلف نظریات رائج ہیں۔

(i) تعلیمی فلسفہ، تعلیمی مشق کی پیروی کرتا ہے۔ بچے کو تعلیم دینے کے عمل میں ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کی اصولی بنیاد تعلیمی فلسفہ دیتا ہے۔ اور اس کی ضرورت کو بتاتا ہے۔

(ii) تعلیمی فلسفہ، تعلیمی عمل کو سمت دیتا ہے۔ درس و تدریس کے درمیان کئی طرح کے موضوعات معلم کے سامنے آتے ہیں اور یہی موضوعات تعلیمی عمل کو سمت عطا کرتے ہیں۔

(iii) تعلیمی فلسفے کے دوسرے دائرے: اس میں تاریخ، ادب وثقافت وغیرہ آتے ہیں۔ چوں کہ فلسفہ سماج کے مقاصد اور اقدار کو متعین کرتا ہے۔اس لیے دوسرے علاقوں سے بھی حقائق کو اخذ کرتا ہے اور پھر اس کا تنقیدی تجزیہ کر کے اقدار و مقاصد کو طے کرتا ہے۔

(iv) تنقیدی عمل: تعلیمی فلسفہ کے تنقیدی عمل میں تعلیم کے سبھی حصے، مضمون، نصاب، طریقۂ تدریس، تعلیمی نظام وغیرہ کا سختی کے ساتھ تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے۔تعلیم سے متعلق نظریوں اور اصولوں کا بھی تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے۔اس لیے اسے سائنسوں کی سائنس کہا جاتا ہے۔ یہ سبھی کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔اس میں تصور اور حاکمیت کے تجربوں کا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مستقل مزاجی کو قائم کرتا ہے اور نظریات کی یکجہتی کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ منطقی سوچ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

1.8 یاد رکھنے کے نکات (Points to Remember)

فلسفہ ایک وسیع مضمون ہے۔جس کے بغیر دنیا اور زندگی کے حقائق کی معلومات حاصل کرنا مشکل ہے۔ یہ زندگی کو مقاصد فراہم کرتا ہے اور کائنات اور زندگی کے وجود کا تجزیہ پیش کرتا ہے انہیں حقائق اور مقاصد کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا شعور عطا کرتا ہے۔فلسفے کے بغیر زندگی کا کوئی وجود نہیں اور اس وجود کو سمجھنے میں تعلیم ہماری مدد کرتی ہے۔ایک معلم کو فلسفے کا علم ہونا ضروری ہے تبھی وہ کائنات اور زندگی کے مقاصد کو طلبا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔طلبا کو زندگی کے اصول اور سلیقہ سکھا سکتا ہے۔ زندگی میں اخلاقیات و اقدار کا فروغ بغیر فلسفے کے ممکن نہیں، اور ان سب کی بنیاد فلسفہ ہے۔تعلیم ہمیں اپنی اخلاقیات و اقدار کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتی ہے اور ان کے اصول تشکیل دیتی ہے۔فلسفہ و تعلیم کا انسانی زندگی میں کافی اہم رول ہے۔اس لیے فلسفہ اور تعلیم کے درمیان ایک تعلق ہے بلکہ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔

1.9 فرہنگ (Glossary)

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
دانشور	علم جاننے والا، عقلمند	وسیع	پھیلا ہوا
سمت	راستہ، رخ	روشناس کرانا	روبرو کرانا

صداقت	سچائی	طرز عمل	برتاؤ
اخلاقیات	اخلاق کا علم	استقرائی	مثال سے اصول کی طرف جانا
استخراجی	اصول سے مثال کی طرف جانا	جمالیات	جمال کی جمع،خوبصورتی
گور	قبر	ممالک	ملک کی جمع، بہت سارے ملک

1.10 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں(Unit End Activities)

معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ فلسفہ کس لفظ سے نکلا ہے؟

2۔ فلسفہ کسے کہتے ہیں؟

3۔ فلسفہ کے متعلق مختلف فلسفیوں کی تعریفات بیان کیجیے۔

4۔ فلسفہ کی خصوصیات کو بیان کریں۔

5۔ فلسفہ کے معنیٰ ،دانش مندی سے.......................... ہے۔

6۔ Fichte نے فلسفے کو.......................... کی سائنس کہا ہے۔

7۔ فلسفہ سائنس بھی ہے اور.......................... بھی۔

8۔ فلسفے کی جس شاخ میں علم سے متعلق مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے اسے.......................... کہتے ہیں۔

9۔ Semantic میں.......................... سے متعلق مسائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

10۔ مختلف ادوار میں تعلیم کے فروغ کا مطالعہ.......................... کہلاتا ہے۔

مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ فلسفہ کیا ہے؟ اور اس کا دائرہ کار کیا ہے۔ تفصیل سے لکھیں۔

2۔ ایک معلم کو فلسفہ کیوں جاننا چاہیے۔ سمجھائیں۔

3۔ تعلیم کے مفہوم اور دائرہ کار کو بیان کریں۔

4۔ تعلیم کے مقاصد کو لکھیں۔

طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ ''تعلیم اور فلسفہ ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں''۔ بحث کریں۔

2۔ فلسفہ،تعلیم اور تعلیمی فلسفہ پر روشنی ڈالیں۔

1.11 تجویز کردہ مواد (Suggested Readings)

1۔ سکشا ادرشن۔ رام ناتھ شرما، راجندر کمار شرما

2۔ ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم۔ ساجد جمال، عبدالرحیم

3۔ سکشا کے دارشنک ایوم سماج شاستریہ سدھانت۔ این آر سوروپ سکسینہ

4۔ اودیامان بھارتیہ سماج میں شکشا۔ ڈاکٹر جے۔ ایس۔ والیہ، جودھپور

5۔ شکشا کی دارشنک پرشٹھ بھومی۔ ڈاکٹر لکشمی لال کے۔ اوڑ، جےئ پور

اکائی 2۔ ہندوستان میں تعلیم: تاریخی تناظر

(Indian Education: Historical Perspective)

اکائی کے اجزا؛

2.1 تمہید (Introduction)

2.2 مقاصد(Objectives)

2.3 عہد قدیم میں تعلیم (ویدک اور بدھسٹ)

(Education During Ancient Period (Vedic & Buddhist)

2.3.1 ویدک دور میں تعلیم(Education in Vedic Era)

2.3.2 بدھسٹ دور میں تعلیم(Education in Buddhist Era)

2.4 عہد وسطیٰ میں تعلیم (Education during Medieval Period)

2.4.1 اسلامی نظامِ تعلیم(Islamic Education System)

2.4.2 ہندو نظامِ تعلیم(Indian Education System)

2.5 عہد جدید میں تعلیم (قبل اور بعد از آزادی)

Education during Modern Period (Pre-Independent & Post- Independent Era)

2.5.1 تعلیم - قبل از آزادی(Education in Pre-Independent Era)

2.5.2 تعلیم - مابعد آزادی(Education in Post-Independent Era)

2.6 ہندوستانی مفکرینِ تعلیم (Indian Educational Thinkers)

2.7 یاد رکھنے کے نکات (Points to Remember)

2.8 فرہنگ (Glossary)

2.9 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں(Unit End Activities)

2.10 تجویز کردہ مواد(Suggested Readings)

2.1 تمہید(Introduction)

دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہندوستانی تہذیب کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستانی نظام تعلیم ساری دنیا کی توجہ کا مرکز کررہاہے۔ یہاں کی قدیم درس گاہیں اور جامعات اپنے اعلیٰ معیار اور تہذیب کی بنیاد پر عالمی معیارات پر پورا اترتی تھیں۔

اس اکائی میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ہمارا تعلیمی نظام عہد بہ عہد مختلف تبدیلیوں سے گزرتا رہا۔ بالآخر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے مستحکم تعلیمی نظام کی شکل اختیار کرتا گیا۔ عہد قدیم سے ویدعہد اور بدھ عہد کے تعلیمی نظام کی امتیازی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس اکائی میں آپ عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے دورجدید میں ماقبل اور بعد آزادی غرض ہر دور میں تعلیم کا مطالعہ کریں گے اور پائیں گے کہ ہر دور کے تعلیم نظام کی اپنی نمایاں خصوصیات ہیں اور زمانہ ماضی میں مذہبی تعلیم پر زور دینے کے باوجود اس وقت کے عصری تقاضوں کو کبھی بھی مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ یہی صورت حال عہد وسطیٰ میں بھی جاری رہی۔ البتہ برطانوی دور میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کا رجحان سامنے آیا اور آزادی کے بعد بھی سیکولرزم کے نام پر یہ جاری ہے۔

بہر حال ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ کسی بھی تعلیمی نظام کے ارتقا میں بعض افراد کا نمایاں کردار ہوتا ہے۔ اور ان کے افکار و خدمات کا مطالعہ کیے بغیر تعلیمی نظام کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس اکائی میں چند منتخبہ مفکرین تعلیم کے افکار و خدمات کی جامع تفصیلات آپ کے سامنے آئیں گی۔

2.2 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ یہاں کی مختلف سطح کے تعلیمی اداروں اور ان کے تعلیمی معیار کا تعین کرسکیں۔

2۔ برہمنی عہد اور بدھسٹ عہد کے تعلیمی نظام کا جائزہ لے سکیں۔

3۔ اس زمانے کے تعلیمی انتظام، تعلیمی ادارے، اساتذہ اور طلبا اور ان کی درسیات کا جائزہ لے سکیں۔

4۔ عہد وسطیٰ اور اس سے قبل اور بعد کے تاریخی حالات کا جائزہ لے سکیں۔

5۔ عہد وسطیٰ میں اسلامی تعلیم کی خصوصیات، تعلیمی نصابات اور ذریعۂ تعلیم پر مباحثہ کرسکیں۔

6۔ ہندوستان میں تعلیمی تبدیلی کا اندازہ لگا سکیں۔

7۔ انگریزوں کے زیر اثر تعلیمی پالیسیوں کا جائزہ لے سکیں۔

8۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد تعلیم کے میدان میں ہوئی ترقیوں اور تبدیلیوں کا جائزہ لے سکیں۔

9۔ تعلیمی ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی تجاویز پیش کرسکیں۔

10۔ مستقبل میں تعلیمی ترقی کا منصوبہ تیار کرسکیں۔

11۔ چنندہ مفکرین کے اصولوں کے مطابق طریقۂ تدریس، نظم وضبط، معلم کے کردار، نصاب پر طلبا بحث کرسکیں اور اس کا اطلاق کرنے کے لیے تجاویز پیش کرسکیں۔

2.3 دورِ قدیم میں تعلیم (ویدک اور بدھسٹ)

Education During Ancient Period (Vedic & Buddhist)

2.3.1 ویدک دور میں تعلیم (Education in Vedic Era)

ہندوستان کی تاریخ تقریباً 5000 سال کے عہد پر محیط ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ویدوں کے عہد سے شروع ہو کر اب تک ارتقا پذیر ہے۔ قدیم ہندوستان میں تاریخ کو تمدن سے الگ کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ اس لیے عہد قدیم کے تعلیمی نظام کو تمدن سے الگ نہیں کر سکتے۔ وید ہندوستان کی قدیم ترین اور مقدس کتاب ہے جس سے اس زمانے کی معاشی، معاشرتی، مذہبی اور روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے تعلیمی نظام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دور حاضر کی طرح دور قدیم میں بھی خاندان ایک سماجی اکائی تھا جس سے فرد کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا اور بچہ شعوری اور لاشعوری طور پر تمدنی زندگی کے تجربات حاصل کرتا تھا۔ خاندان میں رہ کر بچہ زبان، عادات و اطوار اور آداب و اخلاق سب سیکھتا تھا۔ ویدوں میں تعلیم کو سمجھانے کے لیے علم (Knowledge) آگہی، انکساری اور پاکیزگی جیسی اصطلاحوں کا خاص طور سے استعمال ہوا ہے۔ تعلیم کو روشنی (پرکاش) یا ''نور'' سے تعبیر کیا گیا۔ ویدوں میں بے علم انسان کو جانوروں سے تعبیر کیا گیا۔ ویدوں کا ماننا تھا کہ تعلیم سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ''وید'' اصل میں وید (Vid) سے ماخوذ ہے جس کا معنی علم ہے۔ اس وقت مذہبی ماہرین کا ماننا تھا کہ وید اصل میں معبود حقیقی کی تلاش کا ذریعہ ہے اور علم برائی سے نجات کا راستہ بھی۔ ویدوں میں رگ وید، یجور وید، اتھر وید اور سام وید خاص ہیں۔ ان کے علاوہ منوسمرتی اور سمرتی بھی علم و نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ اس دور کے تعلیم کی اصل روح اور خاصیت علم اور تجربے پر زور، خواہشات پر قابو، روحانیت کا فروغ، کردار سازی، فرائض کی انجام دہی، تمدن کی حفاظت وغیرہ ہیں۔ مقاصد تعلیم میں خدا کی عبادت، مذہب کا احساس، نیک کردار، سماجی ذمہ داری، قومی ذمہ داری اور اخلاقی قدروں کا فروغ تھا۔ اس زمانے میں 'آچاریہ' یعنی استاد، مذہب اور طالب علم تینوں مل کر ایک سماجی شمولیت کی تعمیر کرتے تھے۔ برہمی یا ویدک دور کی تعلیم کے اہم نکات میں تعلیم کے اہداف (مقاصد)، تعلیمی نصاب، عورتوں کی تعلیم، طریقۂ تدریس، معلم و متعلم کا تعلق اور تعلیم گاہوں میں نظم و ضبط اس اکائی میں خاص طور سے آپ پڑھیں گے۔

تعلیمی اہداف:

ہر عہد میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد بہتر انسان پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اپنے معاشرے کے ساتھ ساتھ خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز کا بہتر استعمال اور تحفظ کرے۔ ویدک دور میں بھی تعلیم کا یہی اہم مقصد رہا تھا۔ جہاں تعلیم کے ذریعے انسان کو شعوری اور لاشعوری طور پر نیک عادات اور اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ خدا کی پہچان اس تک پہنچنے کے ذرائع، نیکی یعنی پونیہ کو تصور کیا جاتا تھا اور اس کے لیے علم اور تجربے کے ذریعے روحانیت کا فروغ انسانی خواہشات پر کنٹرول اور اعلیٰ کردار کی ترویج تھی۔ اس زمانے میں سماج کے ذریعے اور مذہب کے ذریعے طے کیے گئے فرائض کی انجام دہی بھی تعلیم حاصل کرنے کے اہم مقاصد تصور کیے جاتے تھے۔ یہی نہیں اپنے سماج اور رسم و رواج و تمدن کا تحفظ بھی تعلیم حاصل کرنے کا ایک مقصد تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب ہم ویدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان سے مذکورہ خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔

نصاب تعلیم (Syllabus):

ویدک دور میں تعلیم دو سطحوں پر فراہم کی جاتی تھی۔ ابتدائی سطح اور اعلیٰ سطح، ابتدائی سطح پر زبان اور اس کی قواعد، عام ریاضی، سماجی برتاؤ

اور مذہبی امور کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ان کا ایک بڑا ذریعہ اخلاقی و روحانی کہانیاں ہوتی تھیں۔عام طور سے سنسکرت زبان کو ذریعۂ تعلیم کا محور مانا جاتا تھا۔جن طلبا کو اساتذہ یعنی گرو (اچاریہ) اس لائق سمجھ لیتا کے انہوں نے ابتدائی تعلیم کی درسیات مکمل کر لی ہیں تو انہیں اعلیٰ تعلیم میں داخل کرنے کی سفارش کر دیتا۔اعلیٰ تعلیم میں کچھ خصوصی تعلیمی مقاصد کی تکمیل کی جاتی تھی۔ان مقاصد کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلا سنسکرت زبان و ادب کی تعلیم اور اس کی قواعد جو مذہبی تعلیم اور اقداری تعلیم کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔دوسرے علوم میں ویدک لٹریچر، علم نجوم، علم فلکیات، آیوروید، ریاضی، فوجی تربیت سے متعلق علوم، مویشی پروری زراعت، آرٹ اینڈ کرافٹ اور جسمانی صحت سے متعلق نصابات شامل ہوتے تھے۔ابتدائی اور اعلیٰ دونوں سطحوں کے نصاب میں بالترتیب مختصر و مفصل طور سے ویدوں کی تاریخ گزشتہ تاریخی واقعات، اکابرین مذاہب کی تواریخ، پرانوں پر مباحث، اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہوتے تھے۔ویدک عہد میں من جملہ جن مضامین کو نصاب میں شامل کیا گیا تھا انہیں تکمیل کرنے کی مدت عام طور پر 24 سال کی عمر تک ہوتی تھی۔24 سال، 36 سال اور 48 سال تک کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو 'واسو' (Vasu)، 'رودرا' (Rudra) اور 'آدتیہ' (Adithya) کہا جاتا تھا۔

تعلیم نسواں (Women's Education):

پورے ویدک عہد میں لڑکیوں کی تعلیم کا ثبوت ملتا ہے لیکن لڑکیوں/عورتوں کو گوروکل میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ان کی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا جاتا تھا۔ان کی تعلیم و تربیت امور خانہ داری اور گھریلو انتظام کے علاوہ بچوں کی پرورش و پرداخت کے متعلق ہوتی تھی۔لیکن ویدک ادب میں چند ایسی خواتین کا نام لیا جاتا ہے جنہوں نے ویدوں پر تبصرے کیے ہیں ان میں Ghosa، Lipala، Zoha، Romza، Lopa، Mudra اور Saraswat کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے زمرہ میں Maitree اور Koshthki کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

طریقۂ تدریس (Teaching Method):

آپ جان چکے ہیں کہ ویدک دور کی تعلیم کا اہم مقصد مذاہب کے امور کی تکمیل اور روحانیت کا فروغ تھا۔طریقۂ تعلیم میں اسی نقطۂ نظر سے اساتذہ طلبا کو تعلیم و تربیت فراہم کرتے تھے۔آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ تعلیمی نظام کا مرکز اس پورے دور میں ''گوروکل'' تھا جہاں والدین اپنے بچوں کو ایک مخصوص عمر کے بعد ''گرو'' کے پاس ''ویدیا گرہن'' کرنے کے لیے چھوڑ آتے تھے۔آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ گروکولوں میں اپنا اور گرو کی غذا اور روزانہ کے اخراجات کے لیے ''شیشیہ'' کو بھکشا کے لیے گروکول کے باہر اپنے معاشرے میں جانا پڑتا تھا۔طالب علم دوران تعلیم بیشتر عمر اپنے ہم جماعت اور گروؤں کے ساتھ رہتا تھا۔خاندان سے اس کا رشتہ اس پوری عمر میں کم ہی ہوتا تھا۔اس کا پورا وقت تعلیم و تربیت میں گزرتا تھا۔ویدک نظام تعلیم میں معلم مرکوز (Teacher Centred) ایجوکیشن کی اہمیت مسلم تھی۔چنانچہ نصاب کا تعین، درجہ کا تعین، نظام الاوقات کا تعین اور طالب علم کے آرام کے وقفے کا تعین کرنا، گرو کی ذمہ داری تھی۔چنانچہ طالب علم کے ایام کار اور کام کے اوقات نصابات کی شروعات میں ہی طے کر لیے جاتے تھے۔جس میں بھکشا گرہن کرنے کا وقت بھی شامل ہوتا تھا۔معلم کو سماج میں روحانی پیشوا کا مقام حاصل تھا۔اس لیے سماجی و مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے جب گرو کہیں جاتا تھا تو اپنے ساتھ اپنے طلبا کو بھی لے جاتا تھا تاکہ ان امور کی تربیت کی جا سکے۔معلم اپنے طلبا کی شخصیت کے فروغ کے لیے کئی مہارتوں کی تربیت کرتا تھا۔مثلاً جیوتش ویدیا، بودھ، یوگ، آیوروید ویدیا (علاج و معالجہ) سے متعلق تربیت وغیرہ کی تربیت ان کے طریقے تدریس میں شامل ہوتی تھی۔

آپ یہ جان چکے ہیں کہ تعلیمی اداروں کی دو سطحیں ابتدائی اور اعلیٰ ہوتی تھیں۔ابتدائی تعلیم میں زبان اور مذہبی تعلیم پر زیادہ زور دیا

جاتا تھا۔ زبان کے معاملہ میں منفرد طریقۂ تدریس خاص طور سے سنسکرت زبان کی مختلف مہارتوں کے فروغ کے لیے دیگر طریقوں کے علاوہ یادداشت کا طریقہ، قصہ گوئی کا طریقہ اور نقل نویسی کا طریقہ زیادہ تر اپنایا جاتا تھا۔ جب کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زبان کی اعلیٰ مہارتوں، مذہبی امور، جیوتشی ودیا، پرانوں کا مطالعہ، تاریخ کے علاوہ زراعت، سپہ گیری، آیوروید، ہست ریکھا ودیا اور فلسفہ واقدار کی تعلیم، نصابات میں شامل تھے۔ کئی بڑے گوروکولوں میں راجنتی شاشتر، ارتھ شاشتر اور اوّچ آیوروید کی تعلیم وتربیت بھی شامل تھی۔

متعلم ومعلم کا تعلق ورشتہ (Pupil Teacher Relationship):

ویدک عہد میں برہمن، چھتریہ اور ویشہ طبقے کے بچے آٹھ، گیارہ اور بارہ سال کی عمر میں گروکول میں داخل کیے جاتے تھے۔ داخلے کے بعد ٹیچر ان کی ہمہ جہت ترقی یعنی سروگانگ وکاس کے لیے وہ سارے اقدامات کرتا تھا جو طالب علم کے مستقبل کو روشن کرے۔ اس عہد میں تعلیم کی ابتدا ادھین سے ہوتی تھی جس کا مطلب ہے قریب آنا، نزدیک آنا یعنی شیشہ کی جانب سے گرو کا قرب حاصل کرنا اس نظام تعلیم میں متعلم اور معلم کی استاد کی خدمت کرنا تعلیم کا اہم حصہ سمجھا جاتا تھا۔ گرو کی ذاتی ضرورتوں کا خیال رکھنا طالب علم کی ذمہ داری تھی۔ جیسے اس کے لیے پانی کا انتظام، مسواک کا انتظام، نہانے کا انتظام اور کپڑے دھونے کے انتظام کے ساتھ ساتھ کھانا تیار کرنے کا کام بھی اکثر طلبا کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں استاد کی نافرمانی کو گناہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کے لیے طالب علم کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

تعطیلات میں مذکورہ ذمہ داریاں تو نہیں ہوتیں لیکن گھر سے آتے وقت شیشیہ گرو کے لیے تحفے تحائف اور دکشہ وغیرہ لانے، طلبا کی تعلیم کے اوقات الصبح شروع ہوجاتے، مذہبی رسومات سے آغاز کیا جاتا اور شام کو 'ہوں' کے رسم سے پورا ہوتا۔ اس پورے اوقات میں استاد طالب علموں کی پوری دیکھ بھال کرتا۔ بھیک مانگنا اپنی تعلیمی ضرورت اور اساتذہ کی ضرورت کے لیے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے میں ان کی دل کھول کر مدد کی جاتی تھی۔ کیوں کہ سماج میں اس کو قبولیت حاصل تھی اور یہ تصور کیا جاتا تھا در در بھیک مانگنے سے بچوں میں انکساری اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ طلبا یہ سمجھتے کہ اس میں امیر وغریب طلبا کا کوئی امتیاز نہیں۔ اساتذہ تعلیم کی تکمیل تک طلبا کے ہر طرح کی دیکھ بھال اور علاج ومعالجہ کا خیال رکھتے تھے۔ اگر وہ بیمار ہوجائے، تو ان کا علاج کرایا جاتا۔ طلباء کے اخلاق وعادات کو سنوارنا، سماجی ذمہ داریوں کا احساس دلانا اور گروکول میں سب کے ساتھ انسانی و ہمدردی کا برتاؤ کرنا سکھایا جاتا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد گرو اپنے شیشیہ کو گرہست آشرم شروع کرنے سے قبل ازدواجی زندگی، خاندانی روابط، سماجی فرائض وغیرہ کی تربیت کرتا اور اس کے جملہ امور کا تعارف کرواتا تھا۔ طلبا کے لیے اپنے اساتذہ کی رائے اور حکم فرمان کی مانند ہوتا تھا۔ اس کی حکم عدولی برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ گرو کے سونے سے پہلے طلبا اس کے پاؤں دبانے، سر دبانے اور پیر چھوکر آشیرواد لے کر سونے جاتے۔

نظم وضبط (Discipline):

پورے ویدک/ برہمنی دور میں مذہبی تعلیم کا غلبہ تھا۔ مذہبی سرگرمیاں تعلیم کا اٹوٹ حصہ تھیں جس پر عمل کرنا فرض تصور کیا جاتا تھا اور ان پر برہمہ چاری سختی سے عمل کرتے تھے۔ غیر اخلاقی سرگرمیوں پر سزائیں دی جاتی تھیں۔ گروکول کے ضابطوں پر عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا تھا۔ استاد کا حکم بجالانا قانونی سمجھا جاتا تھا۔ گروکول کے طلبا یعنی برہمہ چاریوں کو جسمانی تعلقات کے افعال سے دور رہنے کے لیے سخت ہدایتیں دی جاتی تھیں اور ان پر عمل درآمد کرایا جاتا تھا تاکہ ان میں مذہبی، اقداری اور اخلاقی اقدار پیدا ہوں۔ عالم انسانیت وقدرتی توازن اور قدرتی ماحول کی قدردانی اور حفاظت سکھائی جاتی تھی۔ جسمانی سزا سے بہت حد تک اجتناب کیا جاتا تھا تاہم ویدک دور کے کچھ زمانوں میں جسمانی سزائیں دینے کے حوالے ملتے ہیں۔ برہمنی تعلیمی نظام مذہبی رسم ورواج کے زیر اثر تھا۔ چنانچہ حکومتیں بدلنے کے بعد بھی اور سیاسی تبدیلیوں کے

بعد بھی ان رسوم ورواج میں کوئی زیادہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی اوران رسم ورواج کی پابندی کرنا طلبا کے لیے بے حد ضروری ہوتا تھا۔نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے اُپنین کی رسم سے لے کر تعلیم کی فراغت تک گروکول کے نظم وضبط اورقوانین کا احترام کرنا اوراس پرعمل درآمد کرنا نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔

تعلیمی اداروں کے اقسام (Types of Eductional Institutions):

ابتدائی ویدک دور میں زیادہ تر تعلیمی ادارے آبادی سے دورقدرتی ماحول میں قائم کیے گئے تھے۔تاہم وسطی ویدک دور سے تعلیمی ادارے بڑے بڑے گاؤں کے کنارے،قصبوں کے کنارے یا پھر مذہبی مقامات سے متصل قائم کیے جانے لگے۔آپ جان چکے ہیں کہ ویدک دور میں تعلیمی اداروں کی دو سطحیں ہوتی تھیں۔ابتدائی تعلیم عام طور سے گھروں میں یا برہمنوں کے گھر پر جا کر حاصل کی جاتی تھی یا چھوٹے مٹھوں سے متصل شالاؤں میں حاصل کی جاتی تھی جب کہ اعلیٰ تعلیمی ادارے یعنی گروکول اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔یہ گروکول عام طور سے رہائشی ہوتے تھے اورطلبا کے رہنے،کھانے اوردرس وتدریس کا انتظام ایک ہی چہاردیواری کے اندر ہوتا تھا۔ان گروکولوں میں زبان وادب، مذہبیات،فلسفہ اوراقداری تعلیم دی جاتی تھی جس کو کھٹیکا (Khatika) کہا جاتا تھا جب کہ کچھ مخصوص مضامین کی تعلیم اس کے بعد فراہم کی جاتی تھی جسے چرنا(Charna) کہا جاتا تھا اور جب طالب علم فلسفہ،پوران،ویاکرن،اورعلم سیاسیات کی تعلیم حاصل کر لیتا تھا تو اسے چتوسپتھی (Chatuspathi) کہتے تھے۔تعلیم کے آغاز میں سبھی ورگ کے طلبا کو اوپنین،سنسکار کی سطح سے آغاز کرایا جاتا تھا۔ویدک دور میں تعلیمی اداروں میں تعلیم کی سطحیں مختلف تھیں۔اس کے لیے کوئی تحریری سند تو نہیں عطا کی جاتی تھی بلکہ طلبا کی قابلیت ہی ان کی سند ہوتی تھی۔12 سالہ تعلیمی نصاب کی تکمیل کے بعد اسناتک(Graduation)،24 سالہ تعلیمی نصاب کی تکمیل کے بعد واسو(Vasu)،36 سالہ تعلیمی نصاب کی تکمیل کے بعد رودرا(Rudra)اورتعلیم کے آخری مرحلے میں 48 سالہ تعلیمی نصاب کی تکمیل کے بعد طلبا کو آدتیہ(Aditya) کی اوپادھیاں پردان کی جاتی تھیں۔ویدک دور میں گروکولوں کے علاوہ کچھ تعلیمی ادارے رشی آشرم(AshramsRishi)،پریشد(Parishads)،سمیلن (Sammelan)اورپربھاچاریہ(Pravacharya) کے ذریعے بھی تعلیم وتربیت فراہم کی جاتی تھی۔

2.3.2 بدھسٹ دور میں تعلیم (Education in Buddhist Era)

ویدک و برہمنی دور سے بدھ کے دور کا تعلیمی نظام یکسر مختلف تھا۔آپ جانتے ہیں کہ بدھ مذہب کی ابتدا ہی برہمن واد کے (Brahmanism) کی مخالفت سے ہوئی تھی۔برہمنی دور میں چھوا چھوت،سماجی بھید بھاؤ،اعلیٰ ادنیٰ کا امتیازی سلوک،رسوم قیود اور تنگ نظری کے تقریباً ڈیڑھ دوہزار سال تک پرانے سماجی نظام کی مخالفت،بدھ نظریہ میں کی گئی تھی۔یہاں غریب،امیر،کالا،گورا،ادنیٰ واعلیٰ بغیر کسی ذات پات کی تمیز کے سب یکساں تھے۔بدھ کے مذہبی نظریے کے فروغ کے فوراً بعد ان کے تعلیمی نظریے کے فروغ کا سلسلہ شروع ہوا۔بعض مورخین اورعلما اس بات سے بھی متفق ہیں کہ بدھ مذہب اوراس کا تعلیمی نظام شانہ بشانہ شروع ہوا۔بدھ نظام تعلیم پانچویں صدی قبل مسیح میں آغاز ہوا۔یہاں کا نظام تعلیم سماجی اور مذہبی دونوں لحاظ سے وہار یا مٹھوں کے اردگرد گھومتا تھا۔بدھ نظام تعلیم کی ساری سرگرمیاں بدھ مذہب کی مرہون منت تھیں۔گوکہ ان کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد فرد کی شخصی وسماجی نشوونما بھی تھی۔لیکن یہ نظریہ حیات بھی مذہب سے الگ نہیں تھا۔یہاں بھی سنگھ یا اجتماعیت کی اپنی اہمیت تھی۔بدھ نظام تعلیم میں ابتدائی زمانہ صرف بدھوں کے لیے مخصوص تھا۔تاہم زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے

نظام میں آفاقیت پیدا ہوئی اور بلا امتیاز مذہب وملت سب کو ان کے تعلیمی اداروں میں داخلہ ملنے لگا اور رفتہ رفتہ سماج کے ہر طبقے کو تعلیم کے مواقع حاصل ہو گئے جو برہمنی دور میں ورنہ سسٹم کی قید میں تھے۔اب بدھ نظام تعلیم کا تعلق دنیاوی مقاصد اور دینی مقاصد دونوں کے لیے یکساں تھا۔ ہاں مگر تعلیم کا سارا انتظام بدھ بھکشوؤں کے سپرد تھا۔

بدھ نظام تعلیم دو سطحوں پر مشتمل تھا۔ابتدائی سطح اور اعلیٰ سطح۔بدھوں کی نظام تعلیم میں سنگھ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔تعلیم کے انفرادی نظام کا تصور نہیں تھا۔تعلیمی اداروں کے اخراجات راجاؤں اور امرا کی طرف سے برداشت کیے جاتے تھے اور وہ اپنے علاقے کے مٹھوں اور وہاروں کے Patronage ہوتے تھے۔ابتدائی تعلیم مفت تھی اور چھ (6) سے بارہ (12) سال کی عمر میں حاصل کی جاسکتی تھی۔12 سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امتحان لیا جاتا تھا۔اور پھر کامیاب طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے نامزد کیا جاتا تھا۔اعلیٰ تعلیم کی مدت (Duration) 12 سے 20 سال یا 25 سال کی ہوتی تھی۔اس تعلیم کے بعد وہ طلبا مذہبی تقاریر اور تبلیغ کا کام کرتے اور ایک بھکشو کے طور پر اپنے آپ کو متعارف کرواتے جنہیں Lipsampada Sanskara کے نام سے جانا جاتا تھا۔یہ تعلیم آٹھ سال کی مدت پر مشتمل ہوتی تھی۔اس نظام میں تعلیم کا مطلب علم کا حصول تھا علم کی ضد نہیں۔وہ علم کا حصول عام آدمی کی بھلائی کے لیے کرتے تھے جو ویدک نظام تعلیم سے قدرے مختلف تھا کیوں کہ ان کی تعلیم کا مقصد صرف مخصوص طبقات کی بھلائی تھا۔سماجی، ثقافتی اور تاریخی، تجدید ان کے حصول تعلیم کا مقصد ہوتا تھا۔اعلیٰ تعلیم کی 12 سالہ مدت میں زبان وقواعد، مذہبیات، علم نجوم، آیوروید فلسفہ کی تعلیم طلبا کو بہم پہنچائی جاتی تھی۔اس کے بعد کی مدت میں چند خصوصی مضامین شامل کیے جاتے تھے۔جس میں مختلف زبانوں پالی، پراکرت اور سنسکرت زبانیں اور ان سے متعلق قواعد اور ادبیات شامل ہوتے تھے۔اس کے علاوہ فلکیات (Cosmology) قانونی معلومات اور چند مہارتیں جس میں Dyeing، Weaving، Spinning وغیرہ کے علاوہ چند پیشہ وارانہ کورسیز مثلاً زراعت، گلہ بانی اور Agriculture، آیوروید، تجارت کے امور شامل ہوتے تھے۔

بدھ نظام تعلیم میں بین مذاہب مطالعہ بھی شامل تھا۔ان کا مذاہب سے متعلق نظریہ ویدک اور برہمنی دور کے نظریے سے قطعی مختلف تھا۔بین مذاہب مطالعہ میں ویدک مذہبی امور، مذہبی معاملات، منطق، فلسفہ اور علم نجوم، ایڈوانس آیوروید شامل تھے۔بدھ دور نے ہندوستان میں اس زمانے کے لحاظ سے ایک اعلیٰ نظام کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی۔ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے کئی ایسے مراکز تھے جہاں بیرونی ممالک سے طلبا اور محققین تعلیم وتحقیق کی غرض سے آتے تھے۔چین، جاپان، کوریا، تبت، جوا، ملیشیا، انڈونیشیا اور بھوٹان وغیرہ ممالک کے طلبا اور محققین خاص طور سے یہاں حصول تعلیم کے لیے آئے تھے۔تعلیم کے میدان میں ٹیکسیلا، نالندہ، ولبھی، وکرم شیلا، جیدنرا، چینیاپتی، جالندھر، متی پور، بجنور، بھدا، ہریتا اور امراوتی وغیرہ ان کے اعلیٰ تعلیم کی معروف درسگاہیں تھیں۔

اہداف:

بدھ نظام تعلیم کا اصل مقصد عام آدمی تک علم اور مذہبی معلومات بہم پہنچانا تھا۔یہاں تعلیم شخصی اور محدود نہیں بلکہ سماجی اور لامحدود تھی۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی ذات، خطہ، مذہب اور رنگ ونسل کا ہو ان کے نظام تعلیم میں تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔تعلیم جسمانی نشوونما وقومی نشوونما اور نفسی حرکی نشوونما کے علاوہ بقائے باہم اور انسانی تمدن کی ترویج کے لیے تھی۔ان کی تعلیم کے اہداف میں شخصیت کی تشکیل پیشہ وارانہ مہارت کا فروغ، بدھ مذہب کی ترویج وتبلیغ وغیرہ خاص طور سے شامل تھے۔

نصاب تعلیم (Syllabus):

آپ جان چکے ہیں کہ بدھ نظام تعلیم میں مرکزی حیثیت بدھ مذہب کی مذہبی تعلیم تھی۔لیکن آگے چل کر اس کا دائرہ کار عوامی اور بین

مذہبی ہوگیا۔ اس کا نصاب تعلیم دو سطحوں پر مشتمل تھا۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم۔ آپ جان چکے ہیں کہ تعلیم میں 6 سال کی عمر پر بچوں کو پہلے پہل داخلہ دیا جاتا تھا اور ان کے نصاب میں پڑھنا سکھانے اور لکھنا سکھانے کے علاوہ (پانچ) مختلف لسانی مہارتیں جو زبان وادب سے متعلق تھیں کہ علاوہ علم الدو دیہ، منطق، روحانیت وغیرہ کی تعلیم نصاب میں شامل تھی۔ ان عمومی مضامین کے علاوہ بدھ مذہب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ابتدائی سطح پر سماجی افادیت کے چند پیشہ وارانہ، اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں زبان وادب (پالی)، سنسکرت، پراکرت اور اس کی قواعد، علم الادو یہ، علم حیوانیات و نباتات، زراعت، تجارتی علوم، زراعتی علوم، سیاسی علوم اور فائن آرٹس کے چند مضامین مثلاً بت تراشی، سنگ تراشی، مجسمہ سازی اور نقاشی ومصوری شامل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر بدھ مذہب کی مخصوص تعلیم دی جاتی تھی۔ بین مذہبیات کے پس منظر میں ان کا موازنہ ومقابلہ کرنے کی غرض سے ہوتا تھا۔

تعلیم نسواں (Women's Education):

ویدک و برہمنی نظام تعلیم کے پس منظر میں ابتدائی بدھ دور میں مٹھوں میں جانے اور سنگھ میں شامل ہونے پر عورتوں پر پابندی تھی۔ لیکن مہا پر جامتی جو مہاتما بدھ کے رشتہ کی ماں تھی اور نظم وضبط کے ذمہ داران کی گزارش پر عورتوں کو سنگھ میں شامل ہونے اور مٹھوں میں جانے کی اجازت مل گئی اور مردوں کی طرح ہی ان پر بھی سنگھ کے قواعد وضوابط (Rules & Regulations) کا نفاذ ہوگیا۔ وہاروں اور مٹھوں میں خواتین کے لیے الگ سے تعلیمی اور مذہبی پروگراموں کے انتظامات کیے جانے لگے۔ بعدازاں کچھ وہاروں اور مٹھوں کی تعمیر وتشکیل صرف تعلیم نسواں کے لیے ہی کی گئی۔ بدھ دور میں لڑکیوں اور عورتوں کے لیے سنگھ کے قوانین کی پابندی کرنا دشوار یوں بھرا تھا۔ چاہے پورے دور میں خواتین کی عمومی تعلیم نہ ہوسکی ہو لیکن بہت ایسی خواتین کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے باضابطہ تعلیم حاصل کی اور مردوں کے شانہ بشانہ تعلیم کے پھیلاؤ کا کام بھی کیا ان میں Pravavti GuptRani، NayanikaRani، Prabhudevi، Vijayanaka، Sheelbhatta اور سنت مترا (اشوک اعظم کی بہن) کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ ویدک دور کے مقابلے میں محدود پیمانے پر ہی صحیح عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کے حقوق اور سہولتیں حاصل تھیں۔

طریقۂ تدریس (Teaching Method):

ویدک دور کے مقابلے اور موازنے میں بدھ عہد کا طریقۂ تعلیم، طرز تعلیم دونوں قدرے مختلف اور زیادہ منظّم نظر آتا ہے۔ ویدک دور میں زبانی تعلیم کا زیادہ چلن تھا۔ لکھنے پڑھنے کی کم گنجائش تھی۔ حالانکہ اخیر ویدک دور میں لکھنے کی روایت نے زور پکڑا اور رسم الخط میں کافی ترقی ہوئی۔ اس کے برعکس بدھ دور میں خانقاہوں، مٹھوں اور وہاروں میں اساتذہ کے ارد گرد سینکڑوں کی تعداد میں ہجوم لگتا رہتا تھا جو دور ونزدیک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ ادارے کے اساتذہ پر منحصر تھا کہ وہ اپنے درجے کے کتنے طلبا کا داخلہ کریں۔ وہ جتنے طلبا کو انفرادی اور اجتماعی توجہ دے کے پڑھا سکتے تھے اتنے طلبا کو اپنے درجہ میں داخل کرتے تھے۔ بدھ دور میں کئی تعلیمی ادارے آج کی بڑی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بھی بڑے تھے۔ ان میں اتنے بلند پایہ عالم وقابل اساتذہ تھے جو اپنی جماعت کے اصول اور قواعد وضوابط کی پابندی سختی سے کرتے تھے۔ مطالعہ و بحث ومباحثہ کے لیے انہیں دن کا بڑا حصہ بھی کم محسوس ہوتا تھا۔ چھوٹے بڑے عالم/ اساتذہ اپنے طلبا کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے آپس میں مشورے کرتے تھے اور طلبا کے شکوک کو دفع کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھتے اور غور وفکر کرتے تھے۔ ممتاز، ذہین طلبا کے نام یونیورسٹی کے بلند دروازے پر اس لیے لکھے جاتے تھے تاکہ دیگر طلبا اس سے Inspire ہوں۔ نالندہ یونیورسٹی کے اساتذہ کتب

خانے کے بغیر کسی تعلیمی ادارے کو ناکارہ اور بیکار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ مت کے مقدس نسخے اور دوسری مذہبی کتابوں کی نقلیں دور دور تک پہنچیں (چین، تبت)، سنسکرت کی چار سو کتابیں جو کہ 5 لاکھ اشعار پر مشتمل تھیں نقل کی گئیں۔ اساتذہ کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ رہائش گاہ سے درجے تک آنے کے لیے انہیں پالکیاں مہیا کرائی جاتی تھیں۔

بدھوں کے زمانے میں کئی ایسے تعلیمی مراکز نے ترقی پائی کہ وہاں نہ صرف بدھ مت کی تعلیم ہوتی تھی بلکہ دور دراز علاقوں کے برہمن بھی اپنے بیٹوں کو وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔ تعلیمی اداروں کا انتظام بہت ہی منظّم طریقے سے چلایا جاتا تھا۔ بدھ ماہرین اساتذہ کے فرائض انجام دیتے اور اساتذہ میں سب سے قابل اور پاک باز شخص کو اس ادارے کا صدر بنایا جاتا تھا۔ الغرض بدھ عہد میں تعلیم کسی خاص فرقے، خطے، گروہ یا ذات تک محدود نہ تھی بلکہ ان درسگاہوں میں بلا لحاظ مذہب و ملت کے کوئی بھی داخل ہو سکتا تھا۔ بہت سے تعلیمی اداروں میں مختلف زبانیں ذریعۂ تعلیم تھیں جن میں پالی، پراکرت، سنسکرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

طلبا اور اساتذہ کے درمیان رشتہ (Pupil-Teacher Relationship):

متعلم اور معلم کے درمیان ربط کے لحاظ سے ویدک اور بدھ عہد دونوں میں یکسانیت تھی۔ دونوں کے تعلیمی نظام میں اساتذہ کی عزت و تکریم سب سے اہم جز تھا۔ چوں کہ تعلیم کی مرکزی حیثیت مذہب تھی۔ اس لیے مذہبی پیشوا سے بھی بڑا اور باوقار منصب عالم کا مانا جاتا تھا اور ہر طالب علم پر اس کی عزت کرنا واجب تھا۔ ویدک دور کے مقابلے میں بدھ دور کے اساتذہ اپنے طلبا کے تئیں زیادہ رحم دل اور Moderate رویّے کے حامی تھے۔ طلبا اور اساتذہ کا باہمی تعلق اور رشتہ اتنا گہرا و مضبوط و پاکیزہ تھا کہ دیگر ممالک کے مورخین نے اس کی تعریف کی ہیں اور اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ یہاں طلبا اور اساتذہ ایک دوسرے کے لیے Devoted تھے اور اگر کبھی کوئی مسئلہ تعلیمی ادارے میں پیدا ہوتا تو اسے استاد اور طلبا خود ہی حل کر لیتے تھے۔ مٹھوں، وہاروں اور خانقاہوں کے درمیان آپسی تال میل کی وجہ سے طلبا پر اس کا مثبت اثر پڑتا تھا۔ بدھ عہد کے تعلیمی نظام میں آٹھ سال کی تعلیم جو بدھ بھکشوؤں کے لیے مقرر تھی اس میں اساتذہ اور طلبا کے رشتے اور مضبوط ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ تعلیم و تربیت کا یہ حصہ بدھ فلسفہ اور بقائے انسانیت کے فلسفے پر محیط تھا۔ اساتذہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ طلبا کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی تمام سرگرمیوں اور عادات و اطوار پر گہری نظر رکھتے تھے۔ طلبا الصبح اپنے اساتذہ کے لیے داتون، نہانے کے لیے پانی وغیرہ کا انتظام کرتے تھے اور مٹھوں وہاروں میں منعقد کیے جانے والے پروگراموں اور سرگرمیوں کے انتظام میں اپنے ساتھ اساتذہ کی خاطر خواہ مدد کرتے تھے۔

نظم وضبط (Discipline):

چوں کہ بدھ نظام تعلیم کی بنیاد مذہبی عقیدے پر رکھی گئی تھی اس لیے نظم و ضبط کے لحاظ سے اساتذہ اور طلبا دونوں کو ان قوانین کی پابندی کرنا لازمی تھا۔ عام طور سے سنگھ کے عائد کردہ ضابطے جسے دس سکھ پدلانی کہتے ہیں اس کا انوپالن، کرنا لازمی تھا۔ وہ دس ضابطے تھے عدم تشدد، اعلیٰ کردار، سچ بولنا، بے وقت کھانے سے احتراز، آرام و آسائش سے الگ رہنا، رقص وموسیقی سے الگ رہنا، نشہ آور چیزوں سے دور رہنا، چغلی و غیبت سے بچنا اور صدقہ و خیرات میں مہنگی چیزیں قبول کرنے سے بچنا۔

ان عام اصولوں اور ضابطوں کے علاوہ (جو عام طلبا کے لیے بنائے گئے تھے) بھکشو بدھ بھکشو طلبا کے لیے مزید آٹھ ضابطوں کی پابندی کرنا لازمی تھا۔ جن میں درخت کے نیچے زندگی بسر کرنا، سادہ کپڑا پہننا، اپنے ہاتھ سے اپنا کھانا تیار کرنا، گائے کے پیشاب کو میڈیسن کے لیے خود جمع کرنا، عیش و عشرت سے بچنا، چوری نہیں کرنا، عدم تشدد اپنانا اور راج گدی کا دعویٰ نہ کرنا۔ مذکورہ دس اور آٹھ ایسے ضابطے اور قوانین

ہیں جن کی پابندی ہر طالب علم کو اپنی تعلیمی سطح کے مطابق اپنانا لازمی قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ کے معاشرتی زندگی میں بھی تشدد اور غیر اخلاقی کام کم سے کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سنگھ کے بنائے ہوئے ضابطے اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مٹھوں اور وہاروں سے نکال دیا جاتا تھا۔

بدھ نظام میں تعلیمی ترقی (Educational Progress in Buddhist System):

بدھ دور کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کے طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اس وقت تک جتنی تعلیمی ترقی ہندوستان کے مختلف خطوں میں ہو چکی تھی اتنی ترقی دنیا کے کسی خطے میں نہیں ہوئی تھی۔ تعلیمی اداروں نے باقاعدہ منظّم ڈھنگ سے اسی زمانے میں اکیڈمک کام کرنا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے تعلیم کا انتظام تو تھا لیکن خالص مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے۔ تعلیمی ادارے بدھ خانقاہوں کا اٹوٹ حصہ تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سماجی اور تعلیمی مراکز بھی۔ ان درسگاہوں میں جدید تعلیمی نظام کی طرح اساتذہ اور طلبا قیام پذیر ہوتے تھے۔ بدھ دور میں ایک سطح سے دوسری سطح کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ ٹیسٹ کا نظام پہلے پہل رائج ہوا۔ اسی دور میں مذہبی اور معاشرتی ترقی کے لیے الگ الگ مضامین کی تعلیم شروع ہوئی۔ یہی دور تھا کہ بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل اور امیر وغریب کے سب کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیے گئے۔ بدھ دور کی تعلیمی ترقی اور انتظام کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان یا دنیا میں پہلی بار ابتدائی تعلیم کو مفت کیا گیا۔ تعلیمی اہداف کے حصول کے لیے نظم وضبط اور اقدار کے ایسے اصول تیار کیے گئے جو کسی نہ کسی صورت میں آج بھی تعلیمی اداروں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ یہی دور تھا جب خواتین کی تعلیم کا باضابطہ آغاز ہوا اور کمرۂ جماعت اور Self Study کے طریقے اپنائے گئے۔ طلبا، اساتذہ اور انتظامیہ کا الگ الگ تصور اور کوآرڈینیشن پوری طرح سے وجود میں آیا۔ عوامی تعلیم کا آغاز اسی دور کی دین ہے۔ بدھ دور کی ایک خوبی یہ ہے کہ ویدک دور کی تعلیم میں جن پیشہ وارانہ اور مہارتوں کی بنیاد پر تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا تھا اس کو کوئی محاذ پر آرٹس، اسکیلس، بھوکیشن اور ادبیا کے میدان میں ترقی ملی۔ کل ملا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید ہندوستان کی تعلیم کی ترقی کی باقاعدہ بنیاد بدھ دور میں پڑی۔ بدھ دور کے تعلیمی انتظام کا اندازہ ان کے بڑے چھوٹے تعلیمی اداروں اور جامعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ چند معروف جامعات کا تذکرہ ثبوت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے:

تیکشیلا (Takshila):

موجودہ راولپنڈی (پاکستان) شہر سے تقریباً 35 کیلومیٹر مغرب میں اس کا قیام ہوا تھا جو گندھار دور حکومت کے زیر انتظام تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ ویدک زمانے میں بھی معروف تھا جسے بدھ عہد میں بہت زیادہ شہرت اور ترقی ملی۔ اس یونیورسٹی کی شہرت اس کے لاتعداد وہاروں، ہاسٹلس اور کتب خانے کی وجہ سے ہے۔ اعلیٰ مذہبی رہنما، مونک، بھکشو اس کا سربراہ یا وائس چانسلر ہوتا تھا۔ 16 سال کی عمر میں طلبا اس کے داخلے کے امتحان میں شریک ہو سکتے تھے اور داخلہ فیس موجودہ ایک ہزار (1000) روپے تھی۔ اگر کوئی طالب علم فیس جمع کرنے سے معذور ہوتا تو طالب علم کو داخلے سے نہیں روکا جاتا بلکہ اس کے بدلے اسے یونیورسٹی کے کچھ کام کرنے پڑتے۔ آپ نے بدھ دور کے تعلیمی نصاب کے متعلق معلومات حاصل کر لی ہے یہی تعلیمی نصاب یہاں نافذ العمل تھا۔

نالندہ (Nalanda):

چینی سیاح TsangHeiun نے موجودہ بہار ریاست کے جنوب میں 40 میل دور نالندہ میں ایک شہرہ آفاق تعلیم گاہ کی تفصیل بتائی ہے۔ مہاتما بدھ کے بہت قریبی ساتھی اور بدھ مذہب کے نہایت اہم رکن Saripita کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے یہ جگہ پہلے سے ہی مشہور تھی۔ شہنشاہ اشوک نے وہاں ایک وہار تعمیر کرایا جو تعلیمی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد میں گپت شہنشاہوں نے نالندہ یونیورسٹی کی بہت

سرپرستی کی اور یہ تعلیمی ادارہ تیزی سے ترقی پایا۔ بدھ دور کی سب سے بڑی یونیورسٹی کو فروغ دینے میں اس عہد کے شہنشاہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ساز وسامان اور جاگیریں مہیا کرائیں۔ کئی گپت راجاؤں نے اس عظیم بدھ تعلیمی مرکز میں مزید وہار اور خانقاہیں بنوائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ گیارہویں صدی تک یہ تعلیمی ادارہ ترقی کرتا رہا۔ یونیورسٹی کا احاطہ ایک میل لمبا اور آدھا میل چوڑا تھا۔ جس میں متعدد خانقاہیں اور استوپ منصوبہ بند طریقے سے قائم کیے گئے تھے۔ مرکزی کالج سے ملحق سات (7) ہال تھے اس کے علاوہ کمرۂ جماعت کے لیے تین سو (300) چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ کئی منزلہ عمارتیں اس کیمپس میں بنائی گئی تھیں۔ یونیورسٹی میں کئی شفاف اور گہرے پانی کے تالاب تھے۔ اس پورے کیمپس کے اردگرد چہار دیواری بنائی گئی تھی۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کے بعد تیرہ (13) ایسی خانقاہوں کا پتہ چلا ہے جن میں طلبا کے لیے قیام کا انتظام تھا اور یہ کم از کم دو منزلہ تھیں۔ ان میں کئی کئی کمرے بنے تھے۔ ہر کمرہ میں دو طالب علم قیام کرتے تھے اور کمروں میں پتھر کے تخت کے علاوہ کتابیں اور چراغ رکھنے کے لیے طاق موجود تھے۔ یونیورسٹی کی وقف جاگیر دو سو گاؤں پر مشتمل تھی جن کی آمدنی سے طلبا کی تعلیمی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں۔ اس عظیم ادارے کے متعلق مشہور مورخ Chang U.N. نے لکھا ہے کہ اس نظام تعلیم میں کئی ہزار اراکین تھے جو سب کے سب بڑے قابل اور بلند پایہ شہرت یافتہ عالم اور مفکر تھے۔ اس تعلیمی ادارے کے سربراہ اور علم وفضل میں عالمی پیمانے کے معیار رکھتے تھے۔ اپنے دلائل، تفاسیر اور رسائل کی تصنیف کے لیے معروف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی بھی تعلیمی ادارہ کتب خانہ کے بغیر نامکمل ہے۔ A.S.Altekol نے ایک استاد کی نگرانی میں 9 طلبا کے تعلیم حاصل کرنے کی بات کہی ہے۔ اساتذہ کی عزت وتوقیر کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے جانے کے لیے پالکیاں مہیا کرائی جاتی تھیں۔ ایک اور مورخ I.Sung نے لکھا ہے کہ ''میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ذاتی طور سے تحصیل علم کا موقع حاصل ہوا ورنہ یہ علم مجھے ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔

وکرم شیلا (Vikramshila):

پال دور حکومت میں دھرم پال بادشاہ جس کا عہد 770 سے 810 تھا اُس نے اس کو قائم کیا تھا۔ یہ مگدھ خطے میں گنگا ندی کے کنارے آباد کیا گیا تھا۔ یہاں کے اساتذہ اعلیٰ پیمانے کے عالم تھے۔ تبّتی تاریخی ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ بدھ مذہب کی بہت سی کتابوں کا تبّتی زبان میں ترجمہ اسی مرکز میں ہوا تھا۔ اس کا نظم ونسق ایک ایگزیکیٹو کے ذمہ تھا۔ یہاں بھی داخلہ کے لیے داخلہ کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اس تعلیمی نصاب میں بدھ مذہبیات، فلسفہ، منطق، ویدک مذاہب کی کتابیں، کرم کانڈ، علم سیاسیات اور مختلف زبانوں ولسانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک سو آٹھ (108) بدھ مونکس کے ذریعے یہاں کی تعلیمی وتدریسی سرگرمیوں کی انجام دہی ہوتی تھی۔ یہ مونک بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں طلبا کی تعداد 3000 بتائی گئی ہے۔ ان طلبا نے بھی سادہ زندگی گزارنے کا فن اپنے اساتذہ سے سیکھا تھا۔

دیگر تعلیمی مراکز (Other Education Centres):

مذکورہ تینوں عالمی شہرت یافتہ جامعات ٹیکشیلا، نالندہ اور وکرم شیلا کے علاوہ بدھ عہد میں مختلف خطوں میں متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے گئے تھے جن میں ساتویں صدی عیسوی کا مشہور بدھ تعلیمی مرکز ولبھی تھا جو کاٹھیوار کے قریب واقع تھا۔ اس کے علاوہ متعدد بدھ خانقاہیں اور تعلیمی مراکز جیندرا (کشمیر)، چیناپتی (پنجاب)، متی پور (U.P)، قنوج (U.P)، ہریانہ، امراوتی کے علاوہ بہار اور بنگال کے متعدد علاقوں میں قائم تھے۔

2.4 عہد وسطیٰ میں تعلیم (Education during Medieval Period)

پورے مسلم عہد کو دو بڑے دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کو ہم دہلی سلطنت کے نام سے جانتے ہیں اور دوسرے کو مغلیہ سلطنت کے نام سے۔ دہلی سلطنت سے قبل ہی مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان کی مذہبی تعلیم کا نقطۂ نظر ہندوستان میں فروغ پانے لگا تھا۔ جس میں وحدانیت کا تصور سب سے اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے اور ہندوستانی معاشرے میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ یہاں ایک سے زیادہ خدا کو ماننے کا چلن عام تھا۔ اسلامی تعلیمات کا دوسرا اہم نکتہ اسوۂ حسنیٰ یا سیرت نبی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے ان دو اہم نکات نے ہندوستانی مذہبی تعلیمات پر گہرا اثر قائم کیا یعنی قادر مطلق جس کے مطابق سبھی انسان ایک جیسے اور برابر ہیں اور ان میں رنگ، نسل، یا خطوں اور جنس کے لحاظ سے کوئی بڑا چھوٹا یا ادنی اور اعلیٰ نہیں بلکہ اپنے افعال و کردار اور علمی برتری کی وجہ سے انسانی اقدار کا تعین ممکن تھا۔

زبان کی تدریس اور ذریعۂ تعلیم کے لحاظ سے سلطنت دور پر عربی زبان کا تسلط قائم رہا جب کہ مغلیہ دور میں فارسی ذریعۂ تعلیم رہی۔ تعلیمی اداروں کی تین سطحیں تھیں۔ پہلی سطح پر وہ مکاتب تھے جو عام طور سے مساجد سے ملحق تھے اور ان میں ابتدائی دینیات اور عربی، فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلم دور حکومت میں مدارس ثانوی تعلیم کے لیے مختص تھے یعنی ابتدائی تعلیم کے بعد کی تعلیم ان مدارس میں دی جاتی تھی جس میں عربی، فارسی کے علاوہ بعض مدارس میں ہندوستانی زبانیں اور ریاضی، سماجی علوم، دینیات اور قضا کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعض بڑے شہروں میں تعلیم کے اعلیٰ مراکز قائم تھے جن میں دینیات، ادبیات، فقہ، احادیث، علم نجوم، فلکیات، علم طب، علم ریاضی اور بعض مدارس میں، جنگی ساز و سامان تیار کرنے کے فن اور مہارت پر مبنی تعلیم اور باغبانی سے متعلق مہارتیں شامل تھیں۔

2.4.1 اسلامی نظامِ تعلیم (Islamic Education System)

اسلامی نظام تعلیم کی اہم خصوصیات میں جو سب سے دیر پا ثابت ہونے والی بات تھی وہ اسلامی تمدن کا ہندوستانی سماج پر اثر اور ہندوستانی رسم و رواج کا مسلمانوں پر اثر۔ اولین فاتحین نے ہندوستانی تمدن اور طرز تعلیم کو اپنانے میں عار نہیں سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر انڈو اسلامک (Indo-Islamic) کلچر کا فروغ ہوا۔ آپ جانتے ہیں کے سلطنت دور کے سبھی خاندانوں یعنی غلام، خلجی، تغلق، سید اور لودھی سبھی نے اسلامی تعلیم کو عام کرنے کی کوشش تو کی لیکن یہاں کی تعلیم و تمدن کا اثر بھی قبول کیا۔ اسلامی تعلیم یہاں کے والدین کے لیے ان کے بچوں کو سب سے بڑا تحفہ تھا جو مساوات کا درس دیتا تھا اور مسلمانوں کو اس حدیث پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیتا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا ''تعلیم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے'' چنانچہ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے مسلمانوں نے مقامی تعلیم، صنعت و حرفت اور مہارتوں کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ مغلیہ سلطنت تک آتے آتے ایک نئی ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا۔ اردو زبان اسی کی دین ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے ہی جہاں کے اعلی تعلیم یافتہ اور متمدن طبقہ عربی اور فارسی زبان میں مہارت حاصل کر کے حکومت کے اعلی عہدوں تک رسائی حاصل کی۔ مسلمانوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت کے تعلیم و تربیت کو ترجیح دی اور مقامی لوگوں کو اعلی عہدوں پر فائز کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اولین سلطان محمد غوری نے اجمیر میں مساجد کے ساتھ ساتھ اسکول بھی قائم کیے اور اس کے جانشین قطب الدین ایبک، التمش، رضیہ، بلبن وغیرہ سبھی نے مساجد کے ساتھ ساتھ مکتب اور مدرسوں کی تعمیر کروائے۔ تعلیم کو عام کرنے میں فیروز شاہ تغلق نے اہم کردار نبھایا۔ اس نے دلی میں ایک بڑے خطہ ارض پر ایک وسیع و عریض عمارت تعمیر کی جو ایک طرف باغوں اور دوسری طرف صاف شفاف پانی کی جھیل سے گھری ہوئی تھی۔

یہاں سیکڑوں بچوں کی تعلیم وتربیت ہوتی تھی۔معروف مورخ N.N. Law نے اس اسکول کوسرکاری امداداور بچوں کووظیفہ دینے کی بات کہی ہے۔سکندرلودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے عربی،اورفارسی پڑھنا شروع کیااورخاصی تعداد میں سرکاری انتظامیہ میں بھرتی ہوئے۔یہ سلسلہ مغل شہنشاہوں تک جاری رہا۔مغل شہنشاہ اکبر کے فرمان کے مطابق ہندوستان کی بہت سی مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا۔جس میں مہابھارت، رماین، اتھرویداورلیلاوتی قابل ذکر ہیں۔ابوالفضل فیضی نے آئین اکبری میں تعلیمی تکنیک کے بارے میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں حرف تہجی پڑھنے میں بچوں کومدت درکارہوتی تھی۔شہنشاہ اکبرنے اس پرروک لگائی اوریہ حکم صادر کیا کہ طلبا کومختلف طریقوں اورتکنیکوں سے اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ کسی بھی ایک حرف کوصرف دودن کے اندرمکمل کرلے۔مغلیہ سلطنت کے دورمیں زبان کی تعلیم کے علاوہ اقدارکی تعلیم(Educational Values) ریاضی، زراعت، طب، منطق وفلسفہ پر زیادہ زوردیا جاتا تھا۔مغل شہنشاہ جہانگیرنے تعلیم کی ترویج کے لیے ایک قانون وضع کیا تھا جس کے مطابق کسی بھی لاوارث یامالدارومسافرکی موت کے بعداس کی جائداداسکولوں اورمساجد کی مرمت پرخرچ کی جائیگی۔اسی کے زمانے میں دلی اوراطراف میں کئی مدارس اورمکاتب تعمیر کیے گئے۔شاہجہاں نے دلی جامع مسجد کے قریب ایک جامعہ کی تعمیر کرائی تھی۔

نصابِ تعلیم(Syllabus):

پورے وسطی عہد میں تینوں سطحوں کے تعلیمی اداروں میں بعض مضامین Fix اوربعض مضامین لچکداررکھے گئے تھے۔نصاب کومذہبی اورغیرمذہبی یعنی دینی اورغیر دینی مضامین میں منقسم کیا گیا تھا اوراسے مکمل کرنے کا وقفہ 12 سال تھا۔غیرمذہبی تعلیم میں عربی گرامر، عربی نثر، انشاپردازی، ادب، منطق، فلسفہ، قانون، علم نجوم، تاریخ، جغرافیہ، علم طب، فلکیات اورزراعت کے علوم شامل تھے۔بعض جگہوں پرجنگی تربیت اورجنگی سازوسامان تیارکرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔مذہبی تعلیم میں قرآن مجیداس کی شرح ومعنی، سیرت نبی، سنت وفقہ اسلامی قوانین اورصوفیا کرام کے اقوال اس زمانے میں عربی اورفارسی کونصاب کا ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔تاہم اورنگ زیب کے زمانے میں جن طلبا کوان زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے میں دقت پیش آئی تھی انہیں ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت تھی۔نصابات میں سرکاری زبان فارسی کے ساتھ ساتھ عربی اورسنسکرت اوربعض علاقائی زبان پراکرت سیکھنے کی بھی چھوٹ تھی۔اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کے لیے خاص مدارس قائم کیے گئے تھے جن میں اسلامی مذہبی تعلیم کی بجائے ہندومذاہب، وید، فلسفہ اورادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔آئین اکبری میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ نصاب کے مطابق ہرطالب علم کوچاہیے تھا کہ ریاضی، زراعت، پیائش، جیومٹری، علم نجوم، منطق، گھریلو معاملات، سرکاری قوانین، علم طب اورتاریخ کا بتدریج علم حاصل کرے۔

طریقۂ تدریس(Teaching Method) :

آپ جان چکے ہیں کہ عہدوسطی کے تعلیمی نظام میں تین سطحوں پرتعلیم کا انتظام تھا۔مکاتب، مدارس اورجامعات۔مکاتب میں طلبا کو حرف تہجی، زبان کی عام معلومات، قواعد، عمومی ریاضی، ابتدائی دینیات، ناظرہ قرآن اوراخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ان مضامین کی تدریس کے لیے اساتذہ تدریس کی مختلف طریقے اورتکنیک استعمال کرتے تھے۔مثلاً قرآن مجیداورگرامر کے لیے حفظ یا Memorisation کا طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔جب کہ زبان کی دیگر مہارتوں کے فروغ کے لیے مثلاً (سننا، بولنا، پڑھنا، لکھنا اورتفہیم) نقل نویسی، املانویسی اورہوم ورک کا طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔ثانوی سطح کے (درجات) کی تدریس میں جہاں زبان وادب منطق وفلسفہ اورحدیث وفقہ کے علاوہ مجسمہ سازی، بت تراشی، پینٹنگ عمارت سازی، سنگ تراشی اورعلم باغبانی کے لیے نظری علوم کے ساتھ ساتھ تجرباتی اورمشقی سیشن کا انعقاد کیا جاتا تھا۔

اساتذہ ان علوم کی تدریس کے لیے Imitation مشقی ،تقریری اور مظاہراتی اور تجرباتی Modes استعمال کرتے تھے۔ بعض بڑے مدارس میں منطق وفلسفہ اور فقہ کی تعلیم کے لیے ذاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ دارالمطالعہ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں قابل ذکر ہے کہ بعض سلاطین وامرا بھی ذاتی مطالعے کا شوق رکھتے تھے اور انھوں نے بہت سی یادداشتیں ، ڈائریاں ، روزنامچہ ، احوال نامے اور تزک تحریر کیے ہیں جوان کے ذاتی مطالعے کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مشہور مغل شہنشاہ ہمایوں اپنی لائبریری میں مطالعے کے بعد پھسل کر گرنے سے انتقال کر گیا تھا۔ دور وسطیٰ میں خصوصیت کے ساتھ تاریخ نویسی اور دستاویز نویسی کا عام رواج تھا۔ جن کے ذریعے اس عہد کی بیشتر معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ دور حاضر میں اساتذہ کی اور مختلف ماہرین کی تربیت کا جس طرح سے خالص ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (Institute) کے ذریعے انتظام کیا جاتا ہے دور وسطی میں اس طرح کا باضابطہ انتظام نہیں تھا۔ بلکہ فارغین کچھ دنوں تک جس کی مدت طے شدہ نہیں تھی اپنے سینئر (Senior) اور قابل اساتذہ کی زیر نگرانی ان علوم کا (Field experience) اور تجرباتی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس کی مثال اساتذہ کی تربیت ، جنگی مہارت کی تربیت ، انتظامی مہارت کی تربیت ، شہ سواری اور محل کے انتظامی امور شامل تھے۔

استاد اور شاگرد کے درمیان رشتہ (Pupil-Teacher Relationship):

عام طور سے متعلم اور معلم کا تعلق ہندوستان کے ہندو عہد سے متاثر تھا۔ جس دور میں گروکولوں میں ، گرو اور ششیہ کا ربط جس طرح تھا عہد وسطی میں بھی بہت حد تک اس کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ استاد کی عزت ، اس کا حکم طلبا کے لیے کسی طے شدہ قانون سے کم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد وسطی میں بعض اساتذہ نے اپنے طلبا کی اس قدر تعلیم وتربیت میں دلچسپی لی کے بعد میں وہ شہرۂ عالم اساتذہ ، مفکر ، منظم صلاح کار اور تاریخ داں بن کر ابھرے۔ تعلیم کی تینوں سطحوں پر یہی رواج عام تھا۔ چھوٹے مکاتب اور مدارس سے طلبا بڑے مدرسے اور جامعات میں اعلی تعلیم کے لیے جب لے جائے جاتے تو والدین کے ساتھ ساتھ ، ڈسپلن کے تعین اور طلبا کے کریکٹر سے متعلق اساتذہ سے اسناد قابل قبول ہوتے تھے۔ ان اسناد کے بغیر داخلہ مشکل ہوتا تھا۔ چھوٹے مدارس مکاتب اور تعلیم گاہوں سے جب بڑے مدارس اور جامعات میں طلبا کا داخلہ ہوتا تو اساتذہ کی سفارشیں اپنے طلبا کے لیے قابل قبول تھیں۔ ان باتوں کا بھی بعض جگہ عہد وسطی کی تاریخ میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ بعض مہارت اور علوم کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد اعلی تعلیم وتربیت کے لیے اساتذہ کے ذریعے اسناد جاری کیے جاتے تھے۔ ان مذکورہ حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عہد وسطی میں معلم اور متعلم کا ربط بہت ہی گہرا اور بعض دفعہ اولاد اور والدین کا سا تھا۔

نظم وضبط (Discipline):

دور قدیم کے تعلیمی نظام کا کچھ پرتو اور عکس عہد وسطی کے تعلیمی نظام میں بھی ملتا ہے۔ جس طرح گروکول سسٹم میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ روزآنہ کے اخراجات کے لیے Bhiksha کا بھی چلن عام تھا اور شاگرد کے ذمہ تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اور استاد کے کھانے پینے کا انتظام Bhiksha کے ذریعے کرنا ہوتا تھا اس طرح تو عہد وسطی میں نہیں تھا۔ کیوں کہ عہد وسطی کے اکثر تعلیمی اداروں خواہ وہ مسلمانوں کے ہوں یا ہندوؤں اور بدھوں کے سب کے لیے عطیات (جاگیریں) دیے گئے تھے اور اس علاقے کے امرا کو یہ ہدایتیں تھیں کے وہ اپنے علاقے کے تعلیمی اداروں کے طلبا اور اساتذہ کے اخراجات کے لیے عطیات مہیا کرائیں۔ اس کے علاوہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کا بیشتر حصہ یتیم ونادار طلبا کے حصول علم کے لیے مخصوص تھا۔ اس وجہ سے دور وسطی میں طلبا بھیک مانگنے یا Bhiksha System سے بہت حد تک آزاد تھے۔ مدارس کے نظم وضبط پر مقامی اور ریاستی کنٹرول بہت کم تھا۔ مقامی انتظامیہ اپنی کمیٹی کے ذریعے اس کا انتظام سنبھالتی تھی اور نظم وضبط کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ بعض بڑے مدارس کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور ان کے نام بڑی بڑی جاگیریں وقف تھیں۔ ان اداروں

کے طلبا کی رہائش کا انتظام بھی انہی مدارس کے کیمپس میں ہوتا تھا۔ عام طور پر یہ ہاسٹل غیر سرکاری ادارے یا عوامی انتظامیہ چلاتی تھی۔ بہت کم جگہوں پر سرکاری ہاسٹل کا انتظام تھا۔ نظم وضبط قائم رکھنے کے لیے طلبا اور اساتذہ کے لیے انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے کئی طرح کے قوانین وضوابط کا نفاذ عمل میں لایا جاتا تھا۔ استاد کی تحریری اجازت کے بغیر کسی طالب علم کو ادارہ چھوڑنے باہر گھومنے حتیٰ کے گھر جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ گویا مدارس اور جامعات میں کچھ رہنما اصولوں کی وجہ سے عمومی طور پر پورے عہد وسطی میں نظم وضبط کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

تعلیم کی ہمہ گیریت اور اسلامی تعلیم (Universalization of Education & Islamic Education):

آپ یہ جان چکے ہیں کہ دور قدیم میں مخصوص طبقات کو ہی تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ورنا سسٹم کے مطابق برھمن کو تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا حق حاصل تھا۔ جب کہ سماج کی دوسری اعلی ذات یا طبقہ کو کچھ حد تک تعلیم اور جنگی تربیت دینے کا چلن عام تھا۔ اس کے برعکس عہد وسطی میں بلا لحاظ رنگ ونسل اور مذہب وملت کے سبھی لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں عہد قدیم کے مقابلے طلبا کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ یہی نہیں لڑکوں کے ساتھ ساتھ بعض شہروں میں لڑکیوں کے مکاتب ومدارس بھی قائم تھے۔

آپ جان چکے ہیں کہ تعلیم کی ابتدا رسم ''بسم اللہ خوانی'' سے ہوتی تھی اور اس کے لیے کوئی ذات برداری یا طبقہ مخصوص نہیں تھا۔ عہد وسطی کے حکمرانوں نے پہلے سے قائم شدہ قدیم درسگاہوں، مٹھوں، خانقاہوں میں جاری تعلیم کو جاری رکھا۔ تعلیم کی ہمہ گیریت کی ایک اہم وجہ صوفیا اور اولیا کی درگاہیں تھیں جہاں بغیر کسی مذہب وملت کی تفریق کے سب کو ان سے علم حاصل کرنے اور روحانی فیض پانے کا حق حاصل تھا۔ Universalization of Education کی وجہ سے ہی عہد وسطیٰ کے تقریباً تمام طبقے جس میں غریب وامیر شہری ودیہی اور ہندو ومسلم نے اپنی ذہانت کے مطابق تعلیم حاصل کی اور اعلی سرکاری عہدوں پر فائض بھی ہوئے۔ ابوالفضل فیضی نے آئین اکبری میں لکھا ہے ''ہر لڑکے کو چاہیے کہ اخلاقیات، ریاضی، زراعت، پیمائش، جیومیٹری، نجوم، فقہ، گھریلو معمولات' سرکاری قوانین، طب فلسفہ منطق اور تاریخ کی کتابیں پڑھے۔ یہی نہیں غیر مسلموں کو ان کی مذہبی زبان سنسکرت کے لیے ویاکرن، نیایہ' ویدانت وغیرہ کی موجودہ ضرورتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔''

تعلیم کی ہمہ گیریت کے لیے خاص طور سے مغلیہ شہنشاہوں نے اپنے سرکاری خزانے میں رقم جمع کرانے کا حکم دیا تھا۔ جو بغیر کسی تعصب کے مدرسوں، مٹھوں، مکتبوں اور بدھ خانقاہوں کو مدد کرتے تھے۔ تعلیم کی ہمہ گیریت کے لیے چھوٹے تعلیمی اداروں کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں تینوں سطحوں کے تعلیمی ادارے قائم تھے۔ ان میں بڑے ادارے دلی، آگرہ، لاہور، جونپور، اجمیر، بیدر، لکھنو، ملتان، فیروزآباد، جالندھر اور بیجاپور وغیرہ میں قائم کیے گئے تھے جہاں ثانوی تعلیم مکمل کر کے طلبا اعلی تعلیم کے لیے داخل ہوتے تھے۔ سلطنت دور حکومت سے لے کر مغل شہنشاہیت تک کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے بہت سے تعلیمی وتمدنی مراکز قائم کیے۔ مثلاً نصیرالدین نے مدرسہ نصیریہ، دلی میں قائم کیا۔ خلجیوں کے دور میں 43 اعلی پایہ کے علما مدارس میں دین وقانون کی تعلیم دینے کے لیے مامور کیے گئے۔ فیروز تغلق کے زمانے میں ہی تعلیم کے میدان میں مزید ترقی ہوئی اور 30 نئے مدارس کھولے گئے اور متعدد پرانے مدرسوں کی از سر نو تشکیل اور مرمت ہوئی۔ غازی الدین نے ایک نہایت ہی عمدہ مدرسہ بنوایا۔ شرقی بادشاہوں نے جونپور اور اس کے اطراف میں چھوٹے بڑے بہت سے مدرسے قائم کیے اور قابل طالب علموں کو مزید تعلیم کے لیے وظیفہ اور جاگیریں عطا کیں جو آگے چل کر اعلی عہدوں پر فائز ہوئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مشہور بادشاہ شیر شاہ سوری نے جونپور کے مدرسے میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ جونپور تاریخ، فلسفہ، سیاست کی تعلیم کے علاوہ فوجی تربیت مختلف دستکاری اور فن تعمیر کی تربیت کے لیے صدیوں مشہور رہا۔ گو کہ مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے بعد مختلف حملہ آوروں نے بڑے بڑے مدارس مکاتب اور مٹھوں کو بھی اپنا

نشانہ بنایا لیکن اب بھی ان تعلیمی اداروں کی متعدد نشانیاں باقی ہیں ۔عہد وسطی میں لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا او ران کے لیے مخصوص ادارے بنائے گئے تھے ۔ جہاں لڑکوں کی طرح ہی لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔تاہم سوسائٹی کی بعض خواتین ہی اعلی تعلیم سے فیض یاب ہوئیں۔لڑکیوں کے خاص مدارس مخصوص شہروں میں ہی تعمیر کیے گئے تھے ۔عہد وسطی میں گلبدن بیگم،نور جہاں،ممتاز محل، جہاں آرا،رضیہ سلطانہ،چاند بی بی اورزیب النسا جیسی خواتین عہد وسطی کے ہمہ گیر تعلیمی سلسلے کی گواہی پیش کرتی ہیں ۔

تعلیمی اداروں کے اقسام: مکاتب،مدارس اور اعلی تعلیمی ادارے:

پورے دور وسطی میں تعلیمی ترقی کی ضمانت اس کے تین طرح کے تعلیمی ادارے فراہم کرتے تھے۔ابتدائی تعلیم کے مکاتب و مدارس جو زیادہ تر مساجد اور خانقاہوں سے ملحق ہوتے تھے ان میں تحتانوی درجے تک اور بعض میں اس سے نیچے ناظرہ قرآن، فارسی اور قاعدہ وابتدائی ریاضی یا علم الحساب کی تعلیم دی جاتی تھی ۔بعض ابتدائی مدارس میں حفظ کا شعبہ بھی ہوتا تھا۔ابتدائی مدارس کی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔کیوں کہ بہت سے علاقوں میں یہ قائم ہوتے اور ثانوی مدارس میں تبدیل یا ضم ہو جاتے ۔ یہاں ابتدائی مکاتب و مدارس ثانوی مدارس کو طلبا فراہم کرتے تھے۔ابتدائی مکاتب و مدارس مساجد و خانقاہوں سے ملحق ہوتے تھے یا پھر وہی شہری تعلیم وشہری علاقوں میں عطیات سے چلائے جاتے تھے۔ یہ عطیات ریاستی اور عوامی دونوں ہوتے تھے ۔بعض دفعہ وقف جائداد کے ذریعے بھی چلائے جاتے تھے۔آج بھی بہت سارے گاؤں و قصبوں میں ان درس گاہوں (Institutions) کو عطیہ کی گئی وقف جائداد کی نشاندہی کی جاسکتی ہے ۔ دور حاضر کی طرح ان کے لیے کوئی باضابطہ بورڈ یا نصابی باڈی نہیں ہوتی تھی ۔بعض مکاتب و مدارس اس ریاست یا اس خطہ کی بڑی جامعات یا مدرسے سے ملحق ہوتے تھے اور ان ہی کی ہدایات اور انعامات ان مکاتب و مدارس میں نافذ العمل تھے ۔ بقیہ مکاتب و مدارس آزادانہ طور پر ابتدائی تعلیم کی درسیات میں شامل نصابات مثلاً قاعدہ، ابتدائی زبان (فارسی،عربی) ابتدائی ریاضی،حفظان صحت، ناظرۂ قرآن اور اقدار کی تعلیم دیتے تھے۔اس سطح پر باقاعدہ نصابی خاکہ یا کریکولم نہیں ہونے کی وجہ سے ٹرم آخری امتحان کا رواج نہیں تھا۔ ہاں مگر پڑھائی جانے والی کتابوں کی تکمیل کے بعد تحتانیہ سطح کی سند تفویض کردی جاتی تھی ۔ دور حاضر کی طرح ہی پورے عہد وسطی میں ثانوی مدارس کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔بعض ثانوی مدارس میں ابتدائی مدارس بھی ہوا کرتے تھے یعنی ایک ہی جگہ تحتانوی اور ثانوی کی تعلیم مکمل کر لی جاتی تھی۔ عام طور سے ثانوی مدرسے شہروں میں یا بڑے شہروں میں قائم ہوتے تھے اور اس خطے کا حاکم اس مدرسے کی سرپرستی کرتا تھا۔آپ جان چکے ہیں کہ ثانوی مدارس میں عام طور سے تحتانوی تعلیم کے بعد کے نصابات اور کتابیں شامل کی جاتی تھیں۔ثانوی مدارس میں تعلیم کا دائرہ کار (Canvas) وسیع ہو جاتا تھا۔ایک طرف اس میں حفظ، قرأت، دینیات، حدیث، تفاسیر، فقہ اور دیگر مذہبی امور اور قوانین کے مضامین شامل نصاب ہوتے تھے تو دوسری طرف سماجی ضروریات اور معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ضروری مضامین شامل نصاب کیے جاتے تھے۔ مثلاً ریاضی، سائنسی علوم منطق وفلسفہ،جیومٹری، اکاونٹس،منشی گیری اور امانت ، پیمائش، غذا و تغذیہ اور علم طب کے ابتدائی نصابات شامل ہوتے تھے ۔ بڑے مرکزی شہروں میں ریاست کے دار الحکومت وغیرہ میں قائم شدہ مدارس میں بڑی عمارتیں جن میں لائبریری اور ہاسٹل کھیل کا میدان پانی کی باولیاں وجھیل وطلبا کے لیے مطبخ کا بھی انتظام ہوتا تھا۔عام طور سے ان مدارس کے ہاسٹل میں طلبا کے لیے Non-Vegitarian کھانے کا انتظام تھا۔عہد وسطی کے ثانوی تعلیم سے متعلق مشہور مورخ ''ابنِ بطوطہ'' نے لکھا ہے کہ'' عام طور سے ہر مدرسے میں ایک لائبریری ہوتی تھی جس میں متعدد مضامین کی بہت سی کتابیں دستیاب تھیں۔جن میں اسلامک لٹریچر، مذہبیات، عربی اور فارسی ادب کی کتابیں شامل تھیں یہ کتب خانے Well furnished ہوتے تھے اس کے مطابق طلبا کے ہاسٹل کے پاس پارک اور لیک اور اسپورٹ گراونڈ کا بھی انتظام تھا۔ثانوی مدارس کے پورے اخراجات اس شہر کے امیر یا حکمراں

کے ذریعے برداشت کیے جاتے تھے۔تاہم بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ امراوروسااور عام عوام بھی مختلف موقعوں پر مدرسے کے اساتذہ اورطلبا کی اعانت کرتے تھے۔ابتدائی یا تحتانوی مدارس کی طرح یہاں بھی کوئی Prescribed curriculum نہیں تھا۔ہاں مگر ثانوی درجات کے لیے علما و ماہرین نے کچھ کتابیں مختص کردی تھیں جن کی تکمیل کے بعد ثانوی درجات کے اسناد دے دیے جاتے تھے۔ عام طور سے فارغین کو حفظ، فارسی،مولوی اورعالم کے اسناد دیے جاتے تھے۔تاہم منشی اور کامل کی اسناد کے ثبوت ملتے ہیں۔

تیسری طرح کے مخصوص تعلیمی ادارے وہ ہوتے تھے جنہیں مدرسہ عالیہ یا جامعہ کا درجہ حاصل تھا۔ان میں Specialized کورسیز تخصیصی و تحقیقی علوم کی تعلیم وتربیت دی جاتی تھی ایسے اداروں کی تعداد بہت کم تھی خاص طور سے ریاستی دارالحکومتوں اور مرکزی شہروں میں یہ ادارے قائم تھے۔ان میں فقہی مباحث،علم الحدیث،تفاسیر،منطق وفلسفہ،طب وجراحت علم نجوم وفلکیات علم کیمیا وعلم نباتات اور مدنی انتظامات کے نصابات شامل تدریس ہوتے تھے اور زمانے کے معروف ومشہور علما وفقہا مجددین ثانوی مدارس کے فارغین کو ان اداروں میں تعلیم وتربیت فراہم کرتے تھے۔ عام طور سے شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے والے قاضی حضرات کی تعلیم بھی انہیں اداروں میں ہوتی تھی۔ان اداروں کے فارغین کو فاضل کامل، منشی کامل، فاضل طب وزراعت اور حکیم وقاضی ومفتی کے اسناد فراہم کیے جاتے تھے۔ان اداروں کے فارغین ثانوی مدارس میں مدرس کے فرائض انجام دیتے تھے اور چند سال کے تجربے کے بعد اعلیٰ درجات کے مدارس میں تدریسی خدمات کے لیے مامور کردیے جاتے تھے۔آپ جان چکے ہیں کہ ایسے مدارس دہلی، فیروزآباد، بدایوں، آگرہ، فتح پورسیکری، بیدر، مالوا، جونپور، گول کنڈہ بیجاپور، خاندیش،ملتان، گجرات،لکھنو، لاہور، سیالکوٹ اور مرشدآباد وعظیم آباد میں قائم تھے۔

مذکورہ مدارس کے علاوہ عہد وسطیٰ میں کچھ علمی مراکز، خانقاہوں اور درگاہوں سے ملحق بھی تھے جہاں بزرگ صوفی علم دین اور پیر طریقت اپنے مریدین اور عام عوام کو احکام الٰہی اور شرعی قوانین، احادیث کی روشنی میں سمجھاتے تھے یہ مراکز عام طور سے مختلف خانقاہوں درگاہوں اور بزرگوں کے مقبروں سے ملحق ہوتے تھے اور وقف جائداد سے ان کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

حکومتی سرپرستی اور تعلیمی ترقی:

Lal & Suba نے اپنی کتاب Development of Indian Education and Its Problems میں وضاحت کی ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام دراصل دوروسطیٰ کے تعلیمی نظام کی دین ہے۔یہی نہیں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ آج بھی ہم تعلیم کو پوری طرح مفت نہیں کرپائے جب کہ دوروسطیٰ کے بیشتر مدارس خواہ وہ تحتانوی ہوں وسطانوی سطح کے ہوں یا اعلیٰ کسی بھی سطح کے طلبا سے کسی طرح کی فیس نہیں لی جاتی تھی حتیٰ کہ ان کی ہاسٹل اور مطبخ کے اخراجات بھی مدارس کے ناظم اور حکومتی سرپرستی میں عطیات کرنے والے افراد کے ذریعے برداشت کیے جاتے تھے۔بعض مدارس کو براہ راست حکومتی سرپرستی حاصل تھی اور اس مدرسے کے تمام تعلیمی اخراجات خواہ وہ اساتذہ کی تنخواہ ہو یا طلبا پر خرچ کیے جانے والے اخراجات سب کے سب حکومت وقت یا حاکم وقت کی اعانت سے ہوتے تھے۔دوروسطیٰ کے دونوں حصوں میں مختلف مدارس اور تعلیمی اداروں کے لیے حکمراں طبقے نے بڑی تعداد میں جاگیریں وقف کی تھیں جن کے ذریعے ان تعلیمی اداروں کے اخراجات چلائے جاتے تھے۔یہی نہیں پہلی بار ذہین اور غریب (Meritorious) طلبا کے لیے اسکالرشپ کا نظام دوروسطیٰ میں ہی شروع ہوا۔اس نظام کو مغلوں کے بعد آنے والی برٹش حکومت اور آزادی کے بعد جدید دور میں بھی نافذ کیا جاتا ہے۔

2.4.2 ہندونظامِ تعلیم(Indian Education System):

ہندوستان پر مسلمان فاتحین کے غلبے کے بعد بھی یہاں کی ہندو اور بدھ تہذیب وتمدن کو سلطانوں/ بادشاہوں نے ہٹانے یا مٹانے کی قطعی کوشش نہ کی بلکہ ان کو اسی نہج پر ترقی کے مواقع فراہم کیے خواہ سلطنت دور ہو یا مغل دور دونوں میں غیر مسلم علما اور پنڈتوں و مٹھ کے ذمے داروں کو کسی طرح کی گزند نہ پہنچائی گئی بلکہ ان کے بہت سارے رسم و رواج کو مسلمانوں نے بھی جزوی طور پر اپنا لیا۔(محمد عمر مسلمانوں پر ہندو تہذیب کا اثر)ان کی مذہبی زبانیں بالی، پراکرت اور سنسکرت کے فروغ کو خاطر خواہ مواقع دیے گئے۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے باقاعدہ سلطنت قائم کرلی تو برھمنی اور بدھ نظام تعلیم جو پہلے سے رائج تھے دونوں پر اسلام کے نظام کا اثر پڑا اور اسلامی نظام پر مقامی تاثر قائم ہو گیا۔ ہندوستانی علوم کے ساتھ ساتھ ہندو عالموں نے ضرورت کے مطابق عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کی اور بغیر کسی تعصب کے شاہی درباروں میں اعلی منصوبوں پر فائز ہوئے۔ اسلامی فلسفہ اور طبی علوم سے یہاں کے علما متاثر ہوئے اور ہندو فلسفہ و آیوروید (Ayurved) کی بہت سی خوبیوں کو مسلمان عالموں نے اپنایا۔ پورے مسلم دور حکومت میں جس طرح اسلامک مدارس مکاتب کو ریاستی/حکومتی امداد جاگیریں،عطیات عطا کی گئی تھیں اسی طرح ہندو اور بدھ مٹھوں اور تعلیمی اداروں کو بھی عطیات اور جاگیریں عطا کی گئیں جو بہت حد تک آج بھی موجود ہیں۔ مغل دور میں وزرا کی کونسل(نورتن) میں خاطر خواہ تعداد میں ہندو علما اور ماہرین رکھے گئے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل، بیربل،اور راجہ مان سنگ سے اس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ دکن کی فتح کے بعد بعض مذہبی اور تمدنی امور کو جوں کا توں رکھا گیا اور انہیں بھی حکومت کی طرف سے اعانت فراہم کی گئی۔ گروکول سسٹم جہاں جہاں قائم تھا اسے بھی کسی طرح کی کوئی مداخلت نہیں کی گئی اور مقامی انتظامیہ کی طرف سے بعض گروکول کو جاگیریں عطا کی گئیں تاکہ تعلیم و تعلم کا بغیر روک ٹوک کے جاری رہے۔

2.5 دورِ جدید میں تعلیم (قبل اور بعد از آزادی)

Education during Modern Period (Pre−Independent & Post−Independent Era)

2.5.1 تعلیم-قبل از آزادی(Education in Pre-Independent Era)

ہندوستان کی سرزمین پرانے زمانے سے ہی غیر ملکیوں کے لیے باعث کشش رہی کیوں کہ دنیا کے بہت سے خطے اسے تعلیمی، تمدنی اور معاشی طور پر ترقی یافتہ ملک تصور کرتے تھے۔ 1458ء میں پرتگالی باشندے Vascode Gama نے یوروپی ممالک کے لیے سمندری راستہ ہموار کیا اور متعدد یوروپین ہندوستان میں سمندری راستے سے تجارت کی غرض سے آنا شروع ہوئے۔ یہ سلسلہ سو سال سے زائد جاری رہا۔ انگریز، ڈچ، فرانسیسی اور ڈینش تاجروں نے تجارتی بالادستی قائم کرنے کی دوڑ بھی قائم رکھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال نے ہندوستان میں انتشار کی صورت پیدا کردی اور یورپی باشندوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں پر اقتدار کے لیے کشمکش شروع ہوگئی۔ اس کشمکش میں ڈینش، ڈچ باشندوں نے پہلے اور پھر فرانسیسیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ہندوستان انگریزوں کے زیر اثر آ گیا۔ حالانکہ آپ اس اکائی میں برطانوی عہد میں تعلیمی ترقی کا مطالعہ کررہے ہیں لیکن جب تک سیاسی اور سماجی حالات کی جانکاری نہیں ہوسکے گی تب تک تعلیمی ترویج و ترقی کا پس منظر بھی معلوم نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی تبدیلی اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

یوروپی ممالک کے باشندوں کا تعلیمی مشن قائم کرنے کا مقصد تعلیم کی ترویج سے زیادہ عیسائی مذہب کی تبلیغ تھی۔ لہٰذا ذریعے اُن کے

ذریعے ممبئی، کوچین، چیتاگاؤ، ہگلی اور دمن و دیپ وغیرہ میں پرائری تعلیم کے ادارے قائم ہوئے۔ 1575ء میں گوا میں پہلا کالج کھولا گیا اور باندرا ممبئی میں 1577ء میں کالج کا قیام ہوا۔ 1613ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد برطانوی تعلیم کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ 1695ء میں ایک چارٹر کے ذریعے برٹش حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشنری اسکول قائم کرنے کی اجازت دے دی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1731ء تک بنگال، ممبئی، مدراس وغیرہ میں سینکڑوں کی تعداد میں پرائمری اسکول قائم کیے۔ بعدازاں مدراس میں ایک ثانوی اسکول کا بھی قیام عمل میں آیا۔ آپ جان چکے ہیں کہ 18ویں صدی کے وسط تک انگریزوں نے اپنے حریف یوروپین، پرتگالیوں، ڈچوں اور فرانسیسیوں پر سبقت حاصل کر لی تھی اور 1755ء میں اسے حق دیوانی کے حصول کے ساتھ ساتھ کمپنی کو ہندوستان میں حکومت کرنے کا اختیار بھی مل گیا۔

1813ء چارٹر ایکٹس سے ہندوستان میں تعلیم کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جو 1854ء کے وڈس ڈسپیچ پر ختم ہوتا ہے۔ یہاں سے 1900ء تک کا زمانہ ہندوستان میں تعلیمی ترقی کا ایک الگ زمانہ ہے۔ 1813ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے سرکار کو تعلیم کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس کے لیے 10,000 پونڈ مختص کیے گئے لیکن 10 سال میں بھی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے یہ رقم خرچ نہ ہو سکی اور مشرق و مغرب کے اختلاف کی وجہ سے 1833ء تک کمپنی نے تعلیمی معاملات میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اصل مسئلہ ذریعۂ تعلیم و تعلیمی طریقوں کا تھا۔ 1831ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جو اس نتیجے پر پہنچی کے ہندوستانی سائنس اور دوسرے علوم عربی، فارسی اور سنسکرت کے ذریعے پڑھائے جائیں۔ محدود انگریزی تعلیم دی جائے اور علاقائی زبانوں کے ذریعے بھی تعلیم کا انتظام ہو۔ 1824ء میں برطانوی سرکار نے گورنر جنرل کو ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ہدایت نامہ جاری کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کمپنی کو ہر قسم کی امداد کی پیش کش بھی کی گئی۔ جس کے نتیجے میں کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج کی از سر نو تنظیم، آگرہ، دہلی، مرشد آباد اور کلکتہ میں مشرقی علوم کے لیے کالجوں کا قیام کلکتہ ایجوکیشن پریس کے قیام اور یوروپی زبانوں کے سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے کی بات کی گئی۔ 1933ء کے چارٹر ایکٹ پر غور کرنے کے بعد عیسائی مبلغوں کو سہولت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے تحت 10 لاکھ روپیہ سالانہ اور ایک لا (Law) ممبر کی تقرری کو منظوری ملی۔ اس چارٹر کی وجہ سے اور لارڈ میکالے جیسے لا ممبر کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیمی ترقی کے امکانات روشن ہو گئے۔ 10 جون 1834ء انگریزی کے ایک ماہر لارڈ میکالے کو کمیٹی کے لا منیجر کی حیثیت سے ہندوستان بھیجا گیا۔ 8 فروری 1835 کو انہوں نے اپنی تاریخی تجویز میکالے منٹس کی صورت میں پیش کی۔ 1833ء اور 1853ء کے درمیان بنگال، ممبئی، مدراس، صوبہ سرحد پنجاب اور اتر پردیش میں انگریزی تعلیم کی تیزی سے ترقی ہوئی اور پیشہ ورانہ تعلیم مثلاً طب، انجینیئرنگ اور قانون کے تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے جس نے Wood ڈسپیچ کی راہ ہموار کی۔

ہندوستان میں تعلیم کے مسائل پر از سر نو جائزہ لینے کے لیے ایک سروے کیا گیا اور اس سروے کے نتائج پر مبنی سفارشات یعنی Wood ڈسپیچ کا اعلان کیا گیا۔ Wood ڈسپیچ ہندوستانی نظام تعلیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی آگے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہندوستانی تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں آزادی سے پہلے بہت سارے اتار چڑھاؤ آئے۔ 1857ء کا انقلاب، ہنٹر کمیشن، کی سفارشات اور دائرہ کار ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے امداد اور وسائل تعلیم نسواں اور دوسرے پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی کی اور یونیورسٹی کمیشن کی تجاویز اور مختلف علاقوں میں یونیورسٹیوں کے قیام کے متعلق آپ آگے کی صفحات میں مطالعہ کریں گے۔ Govt. of Indian Act - 1935 کے تعلیمی مضمرات اور گاندھی جی کی پیش کردہ بنیادی تعلیم کے تصور کا مطالعہ بھی اگلی ذیلی اکائیوں میں شامل ہیں۔

چارٹر ایکٹ 1813:

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار کا یہ پہلا باضابطہ قانونی عمل تھا اس کے ذریعے سرکار کو تعلیم کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس کے لیے

تقریباً ایک لاکھ روپئے کی رقم مختص کی گئی۔ کمپنی کے عہدیداروں میں اس سے متعلق کئی شکوک وشبہات رہے۔ ہندوستانی پس منظر میں تعلیم کو جو مسائل درپیش تھے وہ اس موقع پر زیر بحث آئے۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ کیا ہندوستانیوں کی تعلیم اوران کے مذہب کی تبدیلی کرانے کے لیے مشنریوں کو ہندوستان جانے اور کمپنی کے زیر تسلط علاقوں میں کام کرنے کی اجازت دی جائے؟ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستانی عوام کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ اگر ہاں تو یہ ذمہ داریاں کن تعلیمی سرگرمیوں تک محدود ہونگی اوران کے حدود کیا ہونگے۔ پہلے مسئلے کے حل کے لیے چارٹرا یکٹ میں بیان کی گئی تفصیل یوں تھی۔

''تیرہواں ریزرویشن جس میں حقیقت سارا مشنری سوال درج تھا یہ تھا کہ اس کمیٹی کی رائے ہے کہ ہندوستان میں برطانوی شعور پیدا کرنے کے لیے دیہی باشندوں کی خوشحالی اوران کے مفاد کو فروغ دینا اس ملک کا فرض ہے اور یہ کہ ایسے اقدامات اٹھائے جانے چاہیے جن سے وہاں کے لوگوں کی اخلاقی ترقی ہواور وہ مفید علوم سے متعارف ہوں۔ ان مذکورہ مقاصد کی ترقی اوراعانت کے لیے ہندوستان جانے یا وہاں رہنے کے خواہش مند لوگوں کو قانون کے ذریعے مناسب آسانیاں فراہم کی جانی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشنریوں کو ہندوستان میں داخل ہونے اوروہاں رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہاں وہ تبلیغ کر سکتے ہیں۔ گرجا گھر کی تعمیر کر سکتے ہیں اور تمام مذہبی فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وسیع تر معنوں میں اپنے مشنری فرائض کی پوری تکمیل کر سکتے ہیں۔''

Report of the select committee of the House of commons on the affairs of the East India Company–Appendix–I

بحوالہ سید نوراللہ اور جے پی نائک ''تاریخ تعلیم ہند''صفحہ نمبر 82-83

مذکورہ دوسرے مسئلے کی سب سے شدید مخالفت ڈائریکٹرس کی طرف سے ہوئی کیوں کہ ان دنوں خود انگلستان میں بھی تعلیم کا شعبہ اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر ہندوستانی مقبوضہ علاقوں میں تعلیم کی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی بھی نہیں لینا چاہتی تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس چارٹر کے نفاذ کے بعد کمپنی کے منافع میں گراوٹ آئے گی۔ چارٹرا یکٹ کی ناکامی یا یوں کہیے کہ نافذ العمل نہ ہونے کی ایک وجہ ہندوستانیوں کی بے حسی بھی تھی کیوں کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں قانون اور نظم ضبط کی بالادستی ختم ہوگئی تھی اوران حالات میں کمپنی کو ہندوستانی عوام کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرس ریزرویشن پاس کرانے میں کامیاب ہوگئے جو چارٹر کا 47واں سیکشن بنا۔ اس سیکشن کی رو سے ''گورنر جنرل ان کاؤنسل کا یہ حکم آئینی ہوگا کہ مذکورہ مضمون علاقوں میں فوجی، شہری اور تجارتی شعبوں کے اخراجات اور قرضوں کے سود کے قاعدوں کے مطابق ادائیگی کے بعد منافوں اور محصول کی بچت میں سے ہر سال ایک مخصوص رقم کو جو ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی الگ نکالی جائیگی اور اسے ادب کی ترویج وترقی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ہمت افزائی کے لیے اور ہندوستان کے برطانوی مقبولیت میں رہنے والوں کو سائنسی علم سے متعارف کرانے اوراس کی ترویج کے لیے خرچ کیا جائیں۔

(نوراللہ اور جے پی نائک تاریخ تعلیم ہند صفحہ نمبر 84)

جن ماہرین کا یہ خیال تھا کہ ادب (جس میں عربی اور سنسکرت کے کلاسکی ادب) کی ترویج پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی ہمت افزائی مغربی سائنس کی تعلیم جن کا فروغ ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقے میں ہونا چاہیے وہ ہندوستان کی تاریخ وتمدن سے اور ادب سے متاثر تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مشرق ومغرب میں روشن خیالی اور سائنسی علوم کی ترویج وترقی سے پرانے ڈھنگ کی تعلیم اور مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں پر

روک لگائی جاسکتی ہے۔کل ملا کر 1813 کا چارٹر ایکٹ ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور ہندوستان کے تعلیمی اخراجات کو کمپنی کے فرائض میں شامل کرلیا گیا۔اگلے برسوں میں تعلیمی سرگرمیوں پر خرچ کرنے کے لیے پہلے کی بہ نسبت زیادہ رقم منظور ہوئی۔

لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی 1835:

چارٹر ایکٹ 1813 کی شق نمبر 43 اور ایک لاکھ روپیہ کی تعلیمی اخراجات پر ایک انگریز عالم لارڈ میکالے سے رائے طلب کی گئی۔ 2 فروری 1835 کو انھوں نے اپنی تاریخی تجویز جو''مکالے منٹس'' کے نام سے مشہور ہے پیش کی۔ لارڈ میکالے اصل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے لا ممبر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے وہ اس گرانٹ سے متفق تھے کہ جو مشرقی علوم کی تعلیم کے لیے خرچ کرنے کی بات کہی گئی تھی لیکن وہ مغربی علوم کو مشرقی علوم سے برتر سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں لارڈ بینٹک نے انہیں عوامی تعلیمی کمیٹی کی سربراہی بھی سونپ دی۔ میکالے منٹس میں ہندوستانی ادب وتمدن کو حقیر نظر سے دیکھا گیا تھا اور اس کی تذلیل کی گئی تھی۔ میکالے نے سنسکرت اور عربی ادب کے ساتھ انگریزی ادب کو بھی شامل کیا اور عربی اور سنسکرت علما کے ساتھ انگریزی اسکالر کے نام بھی تجویز کیے۔ کمپنی کو مختص رقومات خرچ کرنے کی مکمل آزادی دی گئی۔ میکالے کے مطابق یوروپ کی کسی اچھی لائبریری کی کتابوں کا ایک سیلف ہندوستان اور عرب کے تمام ادب کے برابر تھا۔ میکالے انگریزی زبان کا زبردست مداح تھا اور ان لوگوں کو ادبی اعزازات دینے کی سفارش کی جو انگریزی ادب سے حقیقی طور پر واقف تھے وہ انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ میکالے نے اونچے طبقات کی تعلیم کو اہمیت دیتے ہوئے اپنی ڈاؤن وارڈ فیلٹیریشن تھیوری پیش کی جس کے مطابق اونچے طبقوں کو تعلیم مہیا کرانے کے بعد سے دھیرے دھیرے تعلیم نچلے طبقوں تک پھیلائی جائیگی۔ مذہبی معاملات میں میکالے معروضیت پر زور دیتے تھے یعنی ان کا نقطۂ نظر روشن خیالی تھی انکا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان کی ذوق و دلچسپی کے بجائے صحت کے لیے مفید کارہو۔ وہ تعلیم میں مقصدیت کے طرفدار تھے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو کمپنی بہادر کے اور برطانوی حکومت کے وفادار ہوں اور ہندوستانی عوام وحکمراں طبقے کے درمیان رابطے کا کام کرے۔ اس طبقے کو نسلاً ہندوستانی اور عقلاً یوروپین بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک انگریزی زبان ہی تعلیم اور علم ودانش کی ضمانت تھی۔ وہ ہندوستان میں علاقائی زبان اور کلاسیکی زبان کے ذریعے تعلیم کے مخالف تھے۔ اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کے موافق مادری زبان کو اسی وجہ سے بہت حد تک نظر انداز کیا گیا۔ بقول میکالے کے:

> ''تمام پارٹیاں اس بات پر متفق معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ ہندوستان کے اس حصے کے باشندوں کے ہاں نہ تو ادبی سرمایا ہے نہ ہی سائنٹیفک معلومات اور وہ اتنی کم مایہ اور ٹھیٹھ ہیں کہ جب تک ان کو کسی دوسرے ذریعوں سے مالا مال نہ کیا جائے ان میں سے کسی میں بھی مفید ادبی، علمی، کام کو منتقل کرنے کا کام آسان نہ ہوگا۔ اس بات سے بھی ہر طرف اتفاق نظر آتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی استطاعت رکھنے والوں کا ذہنی ارتقا صرف اسی زبان کے ذریعے کیا جاسکتا ہے جو مقامی نہ ہو۔''

(بحوالہ: سید نور اللہ وجے۔ می۔ نائک تاریخ تعلیم ہند صفحہ نمبر 100)

کل ملا کر میکالے کی سفارشات کا ہندوستان کے تعلیمی منظر پر دوررس اثر پڑا۔ اس کی کچھ خامیاں ضرور تھیں لیکن ان خامیوں کی نشاندہی کے بعد ہندوستان کی دیسی تعلیم میں بھی سدھار ہونے لگا اور بہت حد تک جدید علوم کو انگریزی کے ذریعے یا ترجمے کے ذریعے پھیلنے کا موقع ملا۔

ووڈ ڈسپیچ (1854) Wood Despatch:

میکالے منٹس کے بعد لارڈ بینٹک کے جانشیں لارڈ آک لینڈ ہندوستان کے گورنر جنرل بنائے گئے۔ مشرقی تعلیم اور مشرقی زبان کے

ذریعۂ تعلیم کے حامی ماہرین تعلیم نے ان کے سامنے ایک عرض داشت پیش کی۔ لارڈ آک لینڈ نے ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کمپنی کی تعلیمی پالیسی میں ترمیم کی اور مشرقی علوم کی تعلیم کے لیے مختص رقم اور مالی معاونت میں اضافہ کیا۔ وظیفوں کی تعداد بڑھائی گئی اور مشرقی علوم کی اشاعت کے انتظامات کیے گئے۔ ایڈم نے لارڈ آک اینڈ کی مدلل رپورٹ پیش کی تھی۔ جس میں بہت ہی قیمتی مشورے دیے گئے۔ اسی درمیان لارڈ ہارڈنگ کا اعلان بھی سامنے آیا۔ اس اعلان کے مطابق انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو ہی ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری مل سکتی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں گھریلو صنعت زوال کا شکار ہو گئی تھی۔ اس لیے روزگار کا واحد وسیلہ کمپنی کی ملازمت ہی تھی۔ اس وجہ سے انگریزی تعلیم کی مانگ میں خاص اضافہ ہوا اور 1853 سے قبل بنگال، ممبئی، مدراس، صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب میں انگریزی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی خاطر خواہ ترقی ہوئی لیکن یہ سارے اقدامات ناکافی تھے اور غیر تسلی بخش تھے۔ جن کی وجہ سے 1853 میں کمپنی کے چارٹر پر از سر نو غور کیا گیا اور ایک وسیع پالیسی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے برطانوی پارلیمنٹ میں اس مسئلے کے حل کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی کا ماننا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم کا خاطر خواہ فروغ کمپنی کے مفاد کے منافی نہیں ہے بلکہ حق میں ہے۔ اسی زمانے میں چارلس وڈ کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر تھے۔ انہوں نے 19 جولائی 1954 کو ہندوستان میں تعلیم سے متعلق ایک اعلامیہ شائع کیا جو وڈس ڈسپیچ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

Woods Despatch کے اعلامیہ کے قابل ذکر نکات درج ذیل ہیں:

(i) عوامی تعلیم کو سرکاری ذمہ داری قرار دیا گیا۔ اخلاقی تعلیم اور ذہنی نشوونما کے علاوہ مشنریوں کے کام تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

(ii) یوروپی زبان و ادب کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ نصاب میں شامل کیا گیا اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم کے لیے تسلیم کیا گیا۔

(iii) یہ بھی بات زیر غور آئی کہ پیشہ وارانہ تعلیم اور تعلیم نسواں کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ تعلیم یافتہ افراد کو نوکریوں میں ترجیح کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں میں تصنیف و تالیف کے لیے ہمت افزائی کی گئی اور ہندوستان کے ایک بڑے مذہبی طبقہ ''مسلمان'' کو اس تعلیمی پالیسی کا حصہ بنایا گیا۔

Wood Despatch کی اہم سفارشات ہیں:

(i) ہر صوبہ میں ایک محکمہ تعلیم کا قیام ہونا چاہیے جس کا سربراہ ناظم تعلیمات ہو۔

(ii) کلکتہ مدارس اور ممبئی میں یونیورسٹیاں قائم کی جائیں اور ان یونیورسٹیوں میں چانسلر، وائس چانسلر اور فیلو تعینات کیے جائیں۔

(iii) عوامی تعلیم پر زور دیا جائے۔

(iv) تعلیم کے لیے مالی امداد کا ایک الگ نظام قائم کیا جائے۔

(v) اساتذہ کی تربیت کے لیے خصوصی ادارے قائم کیے جائیں۔

(vi) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی جائے۔

اس طرح Wood's Despatch کی سفارشات، برطانوی حکومت کمپنی سرکار اور ہندوستانی عوام سب کے مفاد میں تھیں اس

ڈسپیچ کو برطانوی عہد میں تعلیم کے لیے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔لیکن اس پر پوری طرح عمل درآمد نہ ہوسکا کیوں کہ اس کے چند سال بعد ہی 1857 میں انقلاب رونما ہوگیا اور اس کے بعد ہندوستان پر برطانیہ کا راست کنٹرول ہوگیا۔تاہم 1857 سے 1900 تک اس ڈسپیچ کی سفارشات کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی (Education Policies of Lord Curzon):

پچھلے صفحات میں آپ یہ جان چکے ہیں کہ 1854 Wood Despatch چند سال بعد ہی 1857 میں انقلاب کی وجہ سے Despatch کی سفارشات عمل میں نہ لائی جاسکیں اور ہندوستان میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوگیا۔ ہندوستان بالواسطہ برطانوی تاج کے زیر نگیں آگیا۔ 1857 سے 1900 تک کا دور ہندوستانی معاشرے اور تعلیم دونوں کے لیے ہنگامہ خیز رہا۔ 1898 کے بعد لارڈ کرزن کے تعلیمی سدھار کا عہد آتا ہے جس میں ہندوستان کی تعلیم کی تاریخ میں یکسر تبدیلی آگئی۔اب تعلیم کے لیے پہلے سے زیادہ سرمایہ مختص کیا جانے لگا اور تعلیم میں ریاست کا فعال کردار ہونے لگا۔ ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں تعلیمی معیار میں بہتری کی کوشش کی جانے لگی اور ہر معیار و ہر قسم کی تعلیم میں بے مثال توسیع واقع ہوئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں ہندوستانی قوم پرستی کی شدید لہر دیکھنے کو ملتی ہے۔کرزن کے زمانے میں شروع میں ہی مالی دشواریاں ختم ہوئیں اور 1902 سے پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے تک بڑے مالی وسائل حاصل ہوئے۔مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اچھے اور مستحکم مالی تعلقات قائم رہے جس کی وجہ سے ٹیکس کی حصولیابی بہتر ہوئی اور صوبائی حکومتوں نے تعلیم کے شعبے میں زیادہ سرمایہ صرف کیا۔مرکزی سرکار نے بھی اپنی امداد میں اضافہ کیا۔اب تعلیم میں سرکاری گرانٹ این ایڈ کی پالیسی بدل گئی۔ لارڈ کرزن کی قیادت میں تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہوگئی۔اور ریاست کا اختیار نجی تعلیمی تنظیموں پر بھی آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ 1902 کے ایکٹ کی رو سے ابتدائی تعلیم میں نجی تنظیم کے مقابلے سرکاری کنٹرول زیادہ مضبوط ہوگیا۔تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کی کوشش میں لارڈ کرزن نے تعلیمی نتائج کا جائزہ لینے کی بات کہی اور نتائج کی بنیاد پر ان کی توسیع کی بات کہی گئی۔ لارڈ کرزن نے ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لیے زیادہ زور تو نہیں دیا لیکن ان کے معیار کو بلند کرنے کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔

لارڈ کرزن ہندوستانی عوام کے نمائندوں کے لازمی ابتدائی تعلیم کے مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے لیکن ثانوی مدرسوں اور کالج کی منزلوں پر توسیع کے ہر امکان کو قبول کیا۔شرط صرف یہ تھی کہ تعلیمی معیار کو بلند رکھا جائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لارڈ کرزن کے پورے دور میں تعلیمی توسیع سے زیادہ تعلیمی معیار پر دھیان دیا گیا۔

اس زمانے میں قوم پرستی کا رجحان آزادی کے لیے جدوجہد اور پہلی جنگ عظیم نے تعلیمی توسیع اور اس کے معیار کو ٹھیس پہنچایا۔کرزن کے اپنے پروگرام کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کو اولیت دی جاتی تھی چنانچہ اس مقصد کے لیے 27 جنوری 1902 کو ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو برطانوی ہندوستان میں قائم یونیورسٹیوں کی موجودہ حالت اور ترقی کے امکانات کا پتہ لگائے اور اس کے آئین اور کام کی اصلاح کے لیے طریقہ طے کرے۔اس کمیشن کو انڈین یونیورسٹی کمیشن 1902 کے نام سے جانا جاتا ہے۔انڈین یونیورسٹی کمیشن کے حدود متعین کردیے گئے تھے اس لیے اس کی افادیت بھی محدود ہوگئی۔اس میں نہ تو یونیورسٹیوں کی اصلاح کے بارے میں کچھ کیا گیا اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم کو معیار بخشنے والی ثانوی تعلیم کی سطح کے بارے میں۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نظام کی تشکیل نو کے لیے بنیادی ضرورتوں اور بنیادی تبدیلیوں کو بھی موضوع نہیں بنایا گیا۔کمیشن کی سفارشات صرف 5 نکات پر محدود رہیں وہ یہ کہ یونیورسٹی کے نظم ونسق کی تنظیم نو ہو، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زیادہ سخت اور منظم نگرانی کی جائے اور الحاق کی شرائط کو سخت بنایا جائے۔ طالب علموں کے رہنے اور کام کرنے کے حالات کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔

یونیورسٹیاں تدریسی فرائض کی ذمہ داری کے حدود مقرر کریں اور نصاب اور انتظام کے طریقوں میں تبدیلیاں لائی جائیں۔اس کی صرف تین سفارشات کو انڈین یونیورسٹی ایکٹ 1904 میں شامل کیا گیا۔1904 کے یونیورسٹی ایکٹ پر ہندوستانی رائے عامہ نے شدید مخالفت کی۔خاص طور سے ہندوستانی یونیورسٹیز میں fellows کی تعداد محدود رکھنے اور کالجوں کے الحاق کی سخت شرائط کے خلاف۔

کرزن نے کالج کی تعلیم سے متعلق کئی اصلاحات کیں جیسے پرائیویٹ کالجوں کی امداد میں اضافہ کیا گیا تاکہ وہ اپنے آپ کو یونیورسٹیوں کے ضابطوں کے تحت بلند معیار بنا سکیں۔کتب خانوں، ہاسٹلوں وغیرہ کی سہولتیں پہلے سے بہتر فراہم کی گئیں۔1904-05 اور 1908-09 کے درمیان کالج کی تعلیم کے لیے ساڑھے تیرہ لاکھ (1350000) روپیوں کی گرانٹ ان ایڈ منظور کی گئی۔آرٹس، سائنس اور تدریس کی سہولتوں کے لیے خاص طور پر امداد فراہم کی گئی۔

ثانوی تعلیم کے لیے بھی لارڈ کرزن کے کچھ مشورے اور فیصلے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ثانوی تعلیم کے نجی اداروں میں جن کی آمدنی کا دارومدار طلبا کے فیسوں پر تھا جو صرف امتحان کی تیاری کرنے والے اداروں کی حیثیت رکھتے تھے جن کا کام کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں تھا۔لارڈ کرزن نے ثانوی تعلیم کے ان معاملات کو اسی طرح حل کیا جیسے انڈین یونیورسٹی ایکٹ 1904 کالج کی تعلیم کے سلسلے میں انڈین ایجوکیشن کمیشن کی یہ رائے تھی کہ شعبہ تعلیم کو کچھ شرائط کے ساتھ معین کرنا چاہیے۔ثانوی تعلیم کے اسناد کو یونیورسٹیوں کی طرف تسلیم کیے جانے، غیر تسلیم شدہ اسکولوں سے تسلیم شدہ اسکولوں میں منتقلی کی ممانعت وغیرہ کے سلسلے میں وضاحت کی گئی۔ یہاں بھی یعنی ثانوی تعلیم میں لارڈ کرزن کی پالیسی کا اصل مقصد تدریس کے معیار میں اصلاح و ترقی تھا۔اس زمانے میں سرکاری اسکولوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے بڑی بڑی گرانٹس دی گئیں تاکہ یہ نجی اسکولوں کے لیے نمونہ بن سکیں۔ نجی مدرسوں کو اپنے معیاروں کو بہتر بنانے کے لیے ان کے گرانٹ ان ایڈ میں خاطر خواہ اضافے کیے گئے۔ثانوی اسکولوں کے لیے اساتذہ کی ٹریننگ کی ضرورت پر زور دیا گیا۔اور نئے تربیتی اسکول کھولنے کی سفارش کی گئی۔اس زمانے میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ مڈل کلاسوں تک بچے کی مادری زبان کو خاص توجہ دی جائے تاکہ بچے ہائی اسکول کی سطح پر انگریزی ذریعۂ تعلیم کے لائق بن جائیں۔

لارڈ کرزن نے تعلیم کے دوسرے شعبوں میں کئی اصلاحات کیں۔آرٹ اور کرافٹ کے اسکول،ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفوں کا انتظام زرعی تعلیم کے اداروں کو تعلیم کی عملی اور سائنٹیفک بنیادوں پر تشکیل نو کرنے کے ساتھ ساتھ ذہین طلبا کی بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے مقرر کرنے ٹکنالوجیکل تعلیم کی داخلی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ہندوستانی صنعتوں کے فروغ کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔لارڈ کرزن نے اخلاقی تعلیم کی درسیات کی تجدید کرنے اور ان کے لیے درسی کتابوں میں شامل کرنے اور رٹنے رٹانے کے طریقے سے باز رکھنے کے لیے ہدایت جاری کی۔کرزن کے زمانے میں ہی شعبہ آثار قدیمہ کا قیام ہوا تاکہ قدیم عمارتوں اور تہذیب وتمدن کی نشانیوں کو تحفظ فراہم کیا جا سکے اسی کے زمانے میں ہندوستان میں ایک ڈائرکٹر جنرل آف ایجوکیشن کا تقرر عمل میں آیا جو لارڈ کرزن کا تعلیم کے تئیں بہت بڑا کارنامہ ہے۔

انگریزی میڈیم کے ذریعے جدید تعلیم کا تعارف:

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے شمال مشرقی اور جنوبی حصوں پر تسلط قائم کرنے کے بعد مغربی تہذیب وتمدن اور عیسائی مذہب اور انگریزی زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔اس ضمن میں مدارس ممبئی اور کلکتہ، پرسیڈینسی کے اسکولوں اور مدارس کا سروے کیا گیا اور وہاں جاری تعلیم کا میڈیم جاننے کی کوشش کی گئی۔تعلیمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مدارس میں فارسی، عربی یا سنسکرت ذریعۂ تعلیم تھے کچھ مدارس میں

علاقائی زبانیں اور چند اسکولوں میں انگریزی زبان کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنایا گیا تھا۔ ایڈم کی پہلی رپورٹ، دوسری رپورٹ اور تیسری رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی میڈیم کے چند اسکول تھے۔

کل 2567 اسکولوں میں سے صرف 18 اسکولوں کا میڈیم انگریزی تھا۔ اسی طرح 30915 طالب علموں میں سے صرف 252 کی ذریعۂ تعلیم (میڈیم) انگریزی زبان تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر پسند نہیں کیا جاتا تھا تاہم دھیرے دھیرے اور جیسے جیسے عام تعلیم کی وسعت اور انگریزوں کا تسلط بڑھا انگریزی ذریعۂ تعلیم کا دائرہ کار بھی بڑھ گیا۔ اوڈس ڈسپیچ 1854 کے چارٹر ایکٹ 1813 دونوں میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم اور انگریزی میڈیم سے تعلیم کی پرزور سفارش کی گئی۔ 1857 تک انگریزی میڈیم تعلیم کے لیے رائے عامہ تیزی سے ہموار ہوتی جا رہی تھی اور اب انگریزوں کے علاوہ ملک کا دانشور طبقہ بھی ثانوی تعلیم سے انگریزی کو میڈیم کے طور پر منتخب کرنے کی سفارش کی۔ وجہ صاف تھی کہ اس زمانے میں سائنسی و تکنیکی ایجادات تیزی سے ہو رہے تھے۔ اور ان کی تدریس کا انتظام انگریزی ذریعے سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ انگریزی میڈیم کے لیے رائے عامہ کے ہموار ہونے کی ایک وجہ راجہ رام موہن رائے جیسے دانشور بھی تھے اور سرکاری ملازمتوں میں انگریزی جاننے والوں کی ترجیحات بھی تھیں۔ چنانچہ انگریزی کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن نے بھی اس مانگ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ 1833 تک آگرہ کے کالج اور کلکتہ کے مدرسہ میں انگریزی کی کلاسیس کھولنی پڑیں دلی اور بنارس میں ضلع انگریزی اسکول قائم ہوئے۔ میکالے کی رپورٹ میں ادیب اور دانشوروں کے القاب دینے کے لیے ادب کی خدمات میں انگریزی ادب کو بھی شامل کیا گیا۔ حتی کہ ان لقب کے لیے یہ سفارش بھی کی گئی کہ اس شخص کو بھی القاب سے نوازا جائے جو لاک (Locke) کے فلسفے اور ملٹن کی شاعری کا ماہر ہو اور سائنسی ترقی کا حامی ہے۔

لارڈ کرزن کی تعلیمی اصلاحات میں بھی انگریزی ذریعۂ تعلیم سرفہرست تھی۔ اس کے زمانے میں یونیورسٹی کمیشن 1902، انڈین یونیورسٹی ایکٹ 1904 میں بھی خصوصیت کے ساتھ انڈینس کو انگریزی کی تعلیم اور تکنیکی و سائنسی تعلیم کے حصول کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے فروغ ابتدائی مدرسوں کے اساتذہ کی ٹریننگ بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے وظیفے، زرعی تکنیکی تعلیم کے ریسرچ کے اداروں میں انگریزی ذریعے کے تعلیم یافتہ لوگوں ترجیح دی جاتی تھی جس سے آگے آنے والے زمانے میں ماڈرن ایجوکیشن یعنی جدید تعلیمی ترقی کے لیے انگلش میڈیم کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935:

برطانوی عہد کا آخری دور سیاسی اور تعلیمی دونوں لحاظ سے چیلنج کا دور تھا۔ اس لیے کہ ادھر سیاسی سطح پر پورن سوراج کا نعرہ لگ چکا تھا تو تعلیمی طور پر عدم تعاون کی تحریک کے درمیان دیسی تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے اور ایک ایسے تعلیمی نظام کی تلاش کی جا رہی تھی جو اپنے آپ میں خود کفیل ہو اور سرکاری اعانت کے بھروسے پر نہ چلے۔ ایسے میں 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آیا اس ایکٹ کے ایڈمنسٹریشن نے دوعملی نظام کا خاتمہ کر دیا۔ صوبائی ایڈمنسٹریشن کو ایک وزارت کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو اس Legislature کے سامنے جواب دہ تھی۔ جس میں منتخب اراکین کی اکثریت تھی۔ یہ نیا نظام صوبۂ خودمختاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آزادی سے پہلے کی تعلیمی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس میں 1919 کے تعلیمی ایکٹ کے ان قوانین کو کالعدم قرار دے دیا گیا جس میں کئی خامیاں تھیں اور اس ایکٹ کے ذریعے تمام تعلیمی سرگرمیوں کو صرف دو سطحوں میں وفاقی یا مرکزی اور ریاستی یا صوبائی میں تقسیم کر دیا۔ وفاقی یا مرکزی انتظام کے تحت تعلیم و تمدن کے جو ادارے یا معاملات شعبہ آئے تھے ان میں:

(i) Imperial Library کلکتہ، انڈین میوزیم کلکتہ، Imperial War museum، Victoria Memorial کلکتہ اور اسی قبیل کا کوئی دوسرا ادارہ جو وفاقی مالی امداد سے چلتا ہو۔

(ii) فوجیوں کی تعلیم

(iii) بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(iv) قدیم اور پرانی یادگاروں کا تحفظ

(v) آثار قدیمہ

(vi) مرکز کے زیر انتظام اور خطوں میں تعلیم کا انتظام خاص تھا جب کہ ریاستی یا صوبائی اختیارات مرکز کے زیر نگرانی اداروں اور علاقوں کے علاوہ تعلیم سے متعلق تمام معاملات ریاستی یا صوبائی انتظام میں شامل سمجھے جاتے تھے۔

1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت محفوظ اور منتقل موضوعات کے درمیان پرانا امتیاز ختم ہو گیا۔ مرکزی یا وفاقی حکومت کے رول میں کسی طرح کی تبدیلی آزادی کے حصول تک نہ آئی، اور مرکزی حکومت، پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ رہی۔ 1946 میں مرکزی حکومت کا شعبہ تعلیم پہلی بار قومی کنٹرول میں آیا جب جواہر لعل نہرو نے اپنی عبوری کابینہ تشکیل دی اور مولانا آزاد پہلے وفاقی وزیر تعلیم بنائے گئے۔

1936 سے 1947 کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس درمیانی مدت میں یونیورسٹی کے طالب علموں کی تعداد دو گنا ہو گئی لیکن ثانوی تعلیم میں اس لحاظ سے ترقی سست رہی۔ ذریعۂ تعلیم ثانوی منزل میں ہندوستانی زبانوں کو اختیار کیا گیا لیکن اس میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیشہ ورانہ اور متبادل مثلاً Technical، Commercial اور زراعتی تعلیمی اداروں کی ترقی ہوئی اور اس دہائی میں ثانوی منزل پر پہلی دفعہ متبادل پیشہ ورانہ یا Vocational کورسیز کو رواج دیا گیا۔ اسی زمانے میں اساتذہ کی تربیت کا انتظام ٹریننگ کالجوں کے ذریعے کیا گیا اور ٹریننگ کالجوں کی تعداد میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا۔ ٹریننگ کالج میں خواتین کی تعداد زیادہ بڑھی یہ ایک خوشگوار واقعہ تھا۔ اس دہائی میں گاندھی جی کے ذریعے بیسک ایجوکیشن کا تصور پیش کیا گیا جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام الدین نے عملی جامہ پہنایا۔

واردھا تعلیمی اسکیم 1937:

متحدہ ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تعلیمی اداروں کی تعداد کی کمی اور تعلیم میں اخراجات تعلیمی وسعت پہ اثر انداز تھی۔ چنانچہ اتنی بڑی آبادی میں چند فیصد لوگ ہی تعلیم یافتہ تھے۔ انگریزی تعلیم کا دور ہونے کی وجہ سے اور تکنیکی اور صنعتی تعلیم کی ترقی ہونے کی وجہ سے گھریلو صنعتیں اور کاریگر بیکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے بچوں کی بھی تعلیم ایک مسلہ بنا ہوا تھا ایسے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی نے تعلیم کا ایک نظریہ پیش کیا۔ جسے بیسک ایجوکیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جس کی ابتدا واردھا میں ایک اسکیم کے اعلان کے ذریعے ہوئی۔ صوبائی خودمختاری کے قانون کے بعد سات ریاستوں میں کانگریس کی سرکاریں بنیں اور قومی نظام تعلیم کے نظریے کو ان ریاستوں میں فروغ دینے کی بات کہی گئی۔ قومی نظام تعلیم کی تشکیل کے ابتدائی 3 تصورات بیسک ایجوکیشن، تعلیم بالغاں اور چھوت چھات کے خاتمے کے ساتھ ہریجنوں کی تعلیم کا تھا۔ ان سات صوبوں میں اس مانگ کا پرزور مطالبہ کیا گیا جس کے لیے کانگریس نے وعدہ کیا تھا کہ کم سے کم مدت میں عام اور مفت لازمی ابتدائی تعلیم بہم پہنچائی جائے گی لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اس تصور کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کے اخراجات کے لیے نئے ٹیکس عائد کیے جا سکتے تھے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں مہاتما گاندھی نے ایک تجویز رکھی جس کو سرمایے کی کمی کی وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا تھا اور

سات سال کی عام لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم ہر بچے کو بہم پہنچائی جاسکتی تھی۔اس کے تحت تعلیم کے ساتھ ساتھ مفید اور سودمند حرفہ کے ذریعے تعلیم دے کر تعلیم کے عمل کو خود کفیل بنایا جاسکتا تھا۔گاندھی جی کی اسکیم کوئی نئی دریافت نہیں بلکہ اس وقت کے حالات پر خصوصی اطلاق تھا۔انہوں نے لکھا ہے:

''مجھے اس احتیاط پر تعجب بالکل نہیں ہے جس سے وہ (ڈاکٹر اُرڈن ڈیل) خود کفالتی تعلیم کے مسلے کو دیکھتے ہیں۔میرے لیے یہی اصل مسئلہ ہے مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں نے پچھلے چالیس برسوں میں جو کچھ دھندلا دھندلا دیکھا تھا وہ اب حالات کے دباؤ میں بالکل صاف دیکھ رہا ہوں۔میں نے موجودہ نظام تعلیم کے خلاف 1920 میں پر زور الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا اور اب کم ہی سہی لیکن حال میں اس کا موقع ملا ہے کہ سات صوبوں کے تعلیمی نظام پر اثر انداز ہوسکوں جو ملک کی جدوجہد آزادی میں ساتھ کام کرنے والے اور ساتھ تکلیفیں اٹھانے والے رہے ہیں۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس الزام کو کہ تعلیم کا موجودہ طریقہ سرتا پا غلط ہے ثابت کرنے کا ایک شدید جذبہ محسوس کیا ہے اور ان سطروں میں بھی بڑے ناکافی انداز میں جو کچھ کہنے کی جدوجہد کر رہا ہوں وہ مجھ پر محض ایک فوری خیال کی طرح روشن ہوا اور اس نور کی طرح حقیقت روزانہ مجھ پر واضح ہوتی جارہی ہے۔''

(سید نوراللہ اینڈ جے پی نائد۔1BD-صفحہ نمبر 7 بحوالہ)

گاندھی جی نے اس اسکیم کا اعلان 'واردھا' میں کیا۔بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی ماہر تعلیم کی ضرورت تھی جو اس کا خاکہ تیار کرتا اور زمینی حقائق سے روشناش کروا کر عملی جامہ پہناتا۔چنانچہ گاندھی جی نے اس پورے منصوبے کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں روبہ عمل لانے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جو اس کے خاکہ پر غور کرے۔اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لائی جائے اور ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کیا جائے جو بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے علم و عمل اور جسم و دماغ میں ہم آہنگی پیدا کرے۔نیز طلبا میں حرفت کے ذریعے خود کفالتی کا رجحان پیدا کیا جاسکے اس کے ذریعے تعلیم کے اخراجات کا بوجھ والدین اور حکومت پر کم سے کم پڑے۔گوکہ گاندھی جی کی پہلی پسند ڈاکٹر ذاکر حسین تھے لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین کی عدم فرصتی کی وجہ سے یہ کام مشکل نظر آرہا تھا۔چنانچہ گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر علی گڑھ ٹریننگ کالج کے سربراہ اور جوان ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین پر پڑی اور خواجہ غلام السیدین نے گاندھی جی کے اس تعلیمی تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے خاکے میں رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کی بقول محمد حلیم خان صابق صدر تعلیمات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی:

''یہ بات شاید بہت کم افراد کو معلوم ہے کہ اس نصاب کی ترتیب کا کل کام علی گڑھ ٹریننگ کالج کے سپرد کیا گیا تھا اور اس کی تیاری کی سربراہی کی ذمہ داری سیدین صاحب کو دی گئی تھی۔حبیب الرحمن صاحب' عبدالغفور صاحب، تدبر حسین صاحب اور قیصر حسین زیدی صاحب سب نے جو ٹیم ورک کیا وہ دیکھنے کے لائق تھا اور آخر کار اس اسکیم کے مطابق تعلیمی ڈھانچہ کی ترتیب کا خاکہ مرتب کر کے ذاکر صاحب کو پیش کر دیا اور یہ خاکہ اسی طرح عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے پیش کر دیا گیا۔''

(محمد حلیم خان مقدمہ ذکر سیدیں بحوالہ ڈاکٹر ریاض احمد۔مونوگراف خواجہ علام الدین)

اس تعلیمی خاکے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ خود کفالی پہلو مضمر تھا۔یہ تعلیم مفت اور لازمی، سات سال کی ملک گیر پیمانے پہ ہونی چاہیے تھی

اور اس کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ تمام صلاحیتیں اور تمام تربیت جو دی جاتی ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ مرکزی حرفے سے مربوط ہونی چاہیے اور حرفے کے انتخاب میں بچے کے ماحول کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ اس تعلیم کے درمیان انگریزی ہندی پڑھائی جائے گی۔ منتخب حرفوں کی تعلیم اور مشق اس طرح ہوگی کہ بچے کاریگر بن جائیں گے اور ایسی چیزیں بنانے لگیں جو استعمال بھی ہو اور اسکول کے اخراجات کے کچھ حصے کو پورا کرنے کے لیے انہیں بیچا بھی جا سکے۔ تجویز شدہ حرفوں میں کتائی، بنائی، گتے کا کام لکڑی کا کام، باغبانی۔ کچن گارڈننگ اور کھیتی باڑی کے کام کی تجویز تھی حرفے کی تعلیم میکانیکی انداز سے نہیں بلکہ بتدریج دھیرے دھیرے بچے کے سماجی شعور اور سائنٹیفک طریقہ کار سے ہوگا۔ حرفے کو مرکز بنانے والی اس تعلیم میں تمام مضامین حرفے سے مربوط ہونگے یا پھر انہیں بچے کے طبعی و سماجی ماحول سے مربوط کیا جائے گا۔

تعلیم کا یہ نیا نظریہ سات صوبوں میں نافذ کرنے کی سعی کی گئی۔ کہیں زیادہ اور کہیں کم مقبولیت کے ساتھ نافذ العمل ہوا لیکن کچھ ہی دنوں بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس کے بعد ہندوستان چھوڑو آندولن اور پھر پوری آزادی کی مانگ اور پھر آزادی کے حصول کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل درآمد نہ ہو سکا۔ کئی ماہرین تعلیم نے اس کی مخالفت بھی کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کے استادوں کی ٹریننگ کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ کوٹھاری کمیشن کے آنے تک یہ کسی نہ کسی طرح اسکولوں میں نافذ العمل رہا لیکن کمیشن کی رپورٹ کے بعد اس کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی۔

2.5.2 تعلیم - مابعد آزادی (Education in Post-Independent Era)

آزاد ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے جنوری 1948 میں وزیر تعلیم مولانا آزاد کے ذریعے بتلائی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے کہا تھا کہ ''ہندوستان میں تعلیم کا منصوبہ بنانے کے لیے جب کبھی کانفرنس بلائی گئی ہے تو ان میں اصولی طور پر کچھ ترمیموں کے ساتھ مروجہ نظام کو باقی رکھنے کا رجحان رہا ہے۔ اب ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تعلیمی نظام کو بھی ان کے ساتھ قدم سے قدم ملائے رکھنا چاہیے۔ اب تعلیم کی ساری بنیاد بدل جانی چاہیے۔''

آپ جانتے ہیں کہ ہمارا آئین ہمیں اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ سارے شہریوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی یکساں انصاف ملے۔ اظہار خیال، یقین، عقیدے اور عبادت کی آزادی ہو اور مساوی حیثیت کے مواقعے ملے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے شہریوں کو باشعور ہونا نہایت ضروری ہے اور شعور کی کنجی تعلیم ہے گویا کسی ملک کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ہمارا آئین 26 جنوری 1949 کو پاس ہوا (بن کر تیار ہوا) اور 26 جنوری 1950 کو نافذ ہوا۔ اوّل اس بات پر غور وخوض کیا گیا کہ مرکزی حکومت اور ریاستوں کے درمیان تعلیمی ذمہ داریوں کی تقسیم کیسے ہو کیوں کہ آئین تعلیم کے معاملات کو ریاستی فہرست میں رکھنے کی اجازت دیتا ہے جب کہ کچھ معاملات پر مرکز کو پالیسی بنانے اور نافذ کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

آزادی کے وقت ہمارے ملک کی تعلیمی صورت حال بہت زیادہ بہتر نہیں تھی کیوں کہ اس سے پہلے کہ حکومت کو ملک کے عوام کی تعلیمی ترقی سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے آزاد ہندوستان کو پہلا وزیر تعلیم ایسا ملا جس کی دور اندیشی نے بہت جلدی ہی تعلیمی مسائل پر بہت حد تک کنٹرول حاصل کر لیا اور آزادی کے بعد فوری طور پر اٹھائے گئے تعلیمی اقدامات بہت ہی مفید اور دور رس نتائج کے حامل ثابت ہوئے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہمارے ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لیے پنج سالہ منصوبہ تیار کیے گئے۔ ان منصوبوں میں بھی تعلیم کی فوری اور آنے والی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا گیا۔ سارجنٹ پلان میں کی گئی منصوبہ بندی کی بنیاد پر ریاستوں میں تعلیمی توسیع و ترقی کی

اسکیمیں اپنائی گئیں اور مرکز میں وزارت تعلیم کے زیر انتظام سائنسی، تکنیکی و تحقیقی میدان میں پیش رفت کے لیے منصوبہ تیار کیے۔ آزادی کے فوراً بعد 51-50 کے درمیانی وقفے میں تعلیم کی طرف بہت زیادہ توجہ نہ دی جا سکی حالانکہ اس سے قبل ہی 1948 میں رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کا قیام ہوا۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ (55-1951) میں تعلیمی ترقیوں کے لیے 169 کروڑ روپے مختص کیے گئے جس کی وجہ سے ابتدائی تعلیم میں زبردست توسیع ہوئی (ترقی ہوئی) 1952 میں ڈاکٹر لکشمی سوامی مدلیار کی صدارت میں سکنڈری ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ 1953 میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام ہوا جس کی منظوری 1956 میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایکٹ کے تحت ہوئی۔ بنیادی تعلیم، سماجی تعلیم اور تعلیم بالغاں و تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبہ 60-1956 میں تعلیمی کاموں کے لیے 275 کروڑ روپے منظور کیے گئے جس سے پہلے منصوبہ میں شروع کی گئی اسکیموں کو جاری رکھتے ہوئے ان میں مزید توسیع کی گئی۔ ثانوی تعلیم کی از سر نو تنظیم ہوئی اور آل انڈیا کاؤنسل آف سکنڈری ایجوکیشن کی بنیاد پر نیز ڈائرکٹریٹ آف ایکسٹنشن پروگرام آف سکنڈری ایجوکیشن قائم ہوا اسی درمیان ٹکنیکل ایجوکیشن میں زبردست تبدیلی ہوئی۔ بطور خاص یہ منصوبہ ابتدائی تعلیم اور تکنیکی تعلیم کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوا۔

تعلیمی کمیشنوں، کمیٹیوں، پالیسیوں اور سفارشات کا مطالعہ:

آزادی کے فوراً بعد کے عہد میں ہوئی تعلیمی ترقیوں کا مطالعہ آپ نے کیا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے بعد سب سے بڑی تعلیمی تبدیلی 66-1964 کا قومی تعلیمی کمیشن تھا جسے عرف عام میں کوٹھاری کمیشن کہا جاتا ہے۔ آزادی کے وقت اعلیٰ تعلیم میں داخلوں کی کل تعداد دو لاکھ تینتیس ہزار 233000 مرد اور کل 23 ہزار عورتوں کی تھی جب کہ قومی تعلیمی کمیشن کے وقت 66-1965 میں داخلہ لینے والے لڑکوں کی تعداد بڑھ کر 13 لاکھ 70 ہزار اور لڑکیوں کی تعداد 3 لاکھ 1 ہزار ہو گئی۔ اس سے آزادی کے فوری بعد کی تعلیمی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تکنیکل، زراعتی، میڈیکل کی تعلیم میں بھی خاطر خواہ توسیع ہوئی۔ 50-1949 میں زراعت کے 15 کالج، طب کے 35 کالج، انجینیرنگ کے 23 کالج اور ٹکنولوجی کے صرف 5 کالج تھے جو 61-1960 میں بڑھ کر بالترتیب 36، 133، 86 اور 12 ہو گئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں بھی اس زمانے میں خاطر خواں ترقی ہوئی۔ اس زمانے میں تعلیمی ترقی اور توسیع کا ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ دیہی اسکولوں اور لڑکیوں کی تعداد میں توقع سے زیادہ اضافہ ہوا۔

66-1964 میں ملک کے باضابطہ قومی تعلیمی کمیشن نے اپنی سفارشات پیش کی جس سے مستقبل میں تعلیمی ترقی، تعلیمی مقاصد اور تعلیمی تنوع (Diversity) کا پتہ چلتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں مرکزی اسکولوں/ اداروں اور ریاستی اسکولوں/ اداروں کے درمیان ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح پر کچھ مسائل پر پیدا ہونے کی وجہ سے آئینی ترمیم کے ذریعے 70 کی دہائی میں تعلیم کو ریاستی فہرست سے مشترکہ فہرست میں لایا گیا تاکہ اس نہج پر تعلیمی دشواریوں پر قابو پایا جا سکے۔ اسی طرح تعلیم پر کمیشن اور کمیٹیاں تو کئی بنائی جا چکی تھیں لیکن پالیسی بنانے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ 1986 میں نیشنل پالیسی آن ایجوکیشن بنائی گئی اور اس کی ترقی اور کامیابی کا جائزہ لینے کے لیے ہر 5 سال کے بعد پروگرام آف ایکشن (PoA) کا بھی Provision رکھا گیا۔ آزادی کے دس (10) سال بعد ہی یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ صد فی صد خواندگی اگلے دس سال میں حاصل کر لی جائے گی تاہم ہر دس سال کی تکمیل پر اگلے دس سال کا منصوبہ بنانا پڑا۔ اسی ضمن میں ملک میں ابتدائی تعلیم کی توسیع، ترویج اور ترقی کے لیے کئی طرح کے منصوبے بنائے گئے تاکہ ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کا ہدف حاصل کیا جا سکے۔ ان میں UAE EFA اور SSA بطور خاص ہیں۔ 21ویں صدی کے شروع میں ثانوی تعلیم کی ہمہ گیریت کے لیے USE کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے۔

سکنڈری ایجوکیشن کمیشن 1952 :

ثانوی تعلیم، ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے درمیان کی مضبوط کڑی ہوتی ہے کسی بھی ملک کے اعلیٰ تعلیم کی بہتر ترویج و ترقی کے لیے ثانوی تعلیم کا مضبوط ہونا اور ترقی یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ ہندوستان میں بھی یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے قیام کے بعد سب سے پہلے ثانوی تعلیم پر توجہ دی گئی۔1948 اور 1952 میں ڈاکٹر A.L. Mudaliar کی صدارت میں سکنڈری ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا گیا جس نے 1953 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ یہ رپورٹ آزاد ہندوستان میں سب سے پہلی اور اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے جس میں ثانوی تعلیم کی تشکیل نو کے لیے بہت سی سفارشات پیش کی گئیں۔کمیشن نے یہ سفارش کی کہ اسکولی تعلیم کی مدت 12 سال سے گھٹا کر 11 سال کر دینی چاہیے۔ یہ اندازہ لگایا گیا کہ 11 سال کی تکمیل کے وقت ہندوستان میں نوجوانوں کی عمر 17 سال کی ہوگی اور وہ نوجوان یونیورسٹی کے درجات میں داخلہ لینے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوگا۔اس سے پہلے اس منزل کی تعلیم کے لیے 12-13 سال تک کا وقفہ درکار ہوتا تھا۔کمیشن نے ثانوی تعلیم کے نصاب کی از سرنو تدریس کی بھی سفارش کی اور یہ وضاحت کی کہ تدریس میں اگر جدید اور بہتر طریقے استعمال کیے جائیں تو 12-13 سال کی تعلیم کو 11 سال میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔اس کمیشن کی سفارش کے مطابق ابتدائی تعلیم کی مدت 7 یا 8 سال تھی جسے دوزمروں میں 3 سال اور 5 سال یا 3 سال اور 4 سال منقسم کیا گیا تھا۔اور سکنڈری کورس کے لیے 3 یا 4 سال کا وقفہ رکھا گیا تھا۔جس کو کمیشن نے یکساں کر کے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی کل مدت کو 11 سال کرنے کی سفارش کی اور یہ بھی سفارش کی کہ ہائر سکنڈری کے مضامین کے انتخاب کے لیے ذیل کے فارمولے کا استعمال کیا جائے۔

(i) تین زبانیں مادری زبان، وفاقی زبان (ہندی) اور انگریزی جن بچوں کی مادری زبان ہندی تھی انہیں ہندی کے علاوہ کوئی دوسری ہندوستانی زبان پڑھنی تھی۔

(ii) سماجی علوم اور سائنسی علوم، ریاضی کے ساتھ

(iii) اسکولوں میں تجویز کیے گئے حرفوں (کرافٹس) میں سے کوئی ایک حرفہ

(iv) سات اضافی مضامین کی تجویز پیش کی گئی تھی جن میں سے کسی تین کا انتخاب کرنے کے لیے طلبا کو کہا گیا تھا۔ ان مضامین میں ہیومنٹیس، سائنس، تکنیکل، کمرشیل، اگریکلچرل، فنون لطیفہ اور ہوم سائنس کے مضامین شامل تھے۔

سکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے امتحانات کے متعلق بھی کئی اصلاحات کی سفارش پیش کی۔ روایتی امتحان کے طریقوں جو نتائج میں غیر معتبر تھے اور میکانکی تھے ان طریقوں کو بدل کر جانچ کے نئے طریقوں کے ذریعے طالب علم کی سبھی تعلیمی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا شامل تھا۔ تاکہ طلبا کی تعلیمی ترقی کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

سکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے اساتذہ کے معاملے میں بھی کئی سفارشات پیش کیں جس میں ثانوی اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں Allowances، ملازمت کی duration، ریٹائرمنٹ کی عمر اور دوسری ملازمت کی شرطوں کو بہتر بنانے کی سفارش کی تاکہ زیادہ سے زیادہ قابل افراد کو تعلیم کے شعبے میں لایا جاسکے اور ثانوی تعلیم کو بہتر بنایا جاسکے۔

کمیشن نے دیہی اور شہری معاشی ترقی کے لیے ثانوی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے والے نوجوانوں کو تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم لینے کے لیے سفارش کی۔ یہ سفارش ثانوی تعلیم کی تکمیل سے قبل اور ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد دوزمروں کی تھی۔

کمیشن کی دوسری سفارشات میں طریقے تدریس، تجربہ گاہیں فیلڈ ورک اور ہوم سائنس اور زراعت میں بہتر مواقع کے لیے تجرباتی

علم شامل تھے۔ کتب خانوں، تجربہ گاہوں، سمعی و بصری امدادی سامان کے استعمال اور سکنڈری اسکول کے آخری امتحان کی ذمہ داری یونیورسٹی کے بجائے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے ذریعے کرانے کی سفارش کی تھی۔

کوٹھاری کمیشن 1964-66:

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں سب سے جامع اور مفصل تعلیمی دستاویز جسے عرف عام میں کوٹھاری کمیشن کہتے ہیں 1964-66 میں پیش کیا گیا۔ اس تعلیمی کمیشن میں آزادی کے بعد ہوئی تعلیمی ترقیوں کا جائزہ اور اس کے مستقبل کی ترقی کے لیے لائحہ عمل کی سفارش شامل تھی۔ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ڈی۔ ایس کوٹھاری کو حکومت ہند نے اس کا صدر نشیں مقرر کیا۔ یہ اصل میں تعلیم پر قومی ترقی کی ایک تاریخ ساز دستاویز تھی۔ پورے تعلیمی نظام میں تصحیح اور تبدیلی کی ضرورت تھی جو ملک میں انسانی مسائل سماجی فلاح و بہبود اور معاشرتی ترقی اور تعلیم کے مختلف شعبوں جنرل ایجوکیشن، سائنسی تعلیم، تکنیکی تعلیم، اساتذہ کی تربیت، پروفیشنل و ووکیشنل ایجوکیشن، خواتین کی تعلیم زبانوں کی تعلیم درج فہرست اور قبائل اور سماج میں پچھڑ رہے لوگوں کے لیے تعلیم پر غور کر سکے۔ اس کمیشن نے تعلیمی ترقی کا ایک جامع نصب العین پیش کیا۔ حکومت ہند کی قرارداد نمبر۔ مورخہ 14 جولائی 1964 کے مطابق ڈاکٹر کوٹھاری کی صدارت میں 17 رکنی کمیٹی نے اس کا کام شروع کیا۔

قومی تعلیمی کمیشن یا کوٹھاری کمیشن کے ذریعے پیش کیے جانے والی تعلیمی اصلاح اور نصب العین کا اس کے پہلے جملے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ’’ہندوستان کی تقدیر اس کے کلاس روم میں لکھی جا رہی ہے‘‘ یہ صرف کہنے کی بات نہیں تھی بلکہ موجودہ ہندوستان کی تعلیمی ترقی تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ترقی مختلف طرح کی تحقیقی ترقی، انسانی وسائل کی ترقی، اور ایک بے پناہ ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی، انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ، کوٹھاری کمیشن کی سفارشات میں شامل ہیں۔ کوٹھاری کمیشن نے جن تین نہایت ضروری نکات کی نشاندہی کی ان میں قومی ترقی کے پروگرام میں تعلیم کے رول کا از سر نو جائزہ لیا جانا، مناسب کردار ادا کرنے کے لیے موجودہ نظام تعلیم میں ضرورت کے مطابق تبدیلیوں کی نشاندہی کرنا اور اسی بنیاد پر تعلیمی ترقی کا پروگرام ترتیب دینا اور پوری قوت اور عزم کے ساتھ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا۔

کوٹھاری کمیشن کے مقاصد میں سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کے لیے تعلیم کو بہ حیثیت آلہ کار استعمال کرنے کی بات کہی گئی۔ تا کہ عوام کے معیار زندگی اور ان کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تب ہی تعلیم سماجی معاشی، معاشرتی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم پیداوریت کے مطابق ہو، تعلیم سماجی اور قومی یکجہتی کو فروغ دے، حکومتی نظام کی حیثیت سے جمہوریت کو مستحکم کرے اور طرز زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ تعلیم کے ذریعے جدیدیت کے عمل میں تیزی لائی جا سکے اور تعلیم کے ذریعے سماجی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی نشو و نما سے افرادی کردار میں مثبت اور تعمیری تبدیلی لائی جا سکے۔ کوٹھاری کمیشن کی تجاویز کے مطابق سائنس، اسکول کی تعلیم کا لازمی جز ہونا چاہیے جسے بعد میں یونیورسٹی سطح تک توسیع کی جا سکے۔ کام کا تجربہ یعنی ورک ایکسپیرینس اور تجربہ گاہ کے عمل تعلیم کا حصہ ہونا چاہیے۔

ورک ایکسپیرینس کے ذریعے پیشہ ورانہ زراعت، انڈسٹری اور ٹکنالوجی کی تعلیم و تربیت میں معنویت پیدا کی جائے۔ ثانوی تعلیم کو بڑے پیمانے پر پیشہ ورانہ بنایا جائے۔ اعلیٰ تعلیم میں زراعت اور تکنیکی تعلیم کو اہمیت دی جائے۔ تعلیم سے سماجی افادیت اور Sustainable development کا کام لیتے ہوئے ایک مشترکہ تعلیمی نظام قائم کیا جائے، تمام طالب علموں کے لیے تعلیم کی ہر سطح پر سماجی خدمت (Social Work) کو لازمی قرار دیا جائے۔ پرائمری سطح کی تعلیم میں سماجی خدمت کو بنیادی تعلیم کی اسکیم سے جوڑا جانا چاہیے۔ ثانوی تعلیم اور اعلیٰ ثانوی

سطح کی تعلیم میں تیس دن 30 اور بیس دن 20 کے لیے سماجی خدمات کے پروگرام ترتیب دیا جانا چاہیے۔ UG اور PG سطحوں پر سماجی خدمت کے وقفے کو 60 دن تک توسیع کر دینا چاہیے۔ تمام تعلیمی اداروں میں سماجی خدمت اور کمیونٹی سروس کے پروگرام کا انعقاد کرنا چاہیے۔ موجودہ NSS کی اسکیم کی توسیع کی جانی چاہیے۔ مناسب لسانی پالیسی اپنا کر قومی یکجہتی کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ مادری زبان کو تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ علاقائی زبانوں میں بھی نصابی کتابوں کی تیاری ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں سائنسی تعلیم اور سائنسی نصاب کو بالخصوص ذہن میں رکھنا چاہیے۔ نئی نئی ایجادات کو ترجمے کے ذریعے علاقائی زبانوں میں نصابی کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ قومی اداروں کے لیے فی الوقت انگریزی زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ اور آہستہ آہستہ نیشنل زبان ہندی کو اس کی جگہ لینی چاہیے۔ مختلف علاقائی زبانوں کو وہاں کے انتظام میں استعمال کیا جانا چاہیے۔ انگریزی زبان کی تدریس کا آغاز اسکولی سطح سے ہی ہونا چاہیے اور دوسری بین الاقوامی زبانوں کی تدریس کو رفتہ رفتہ شامل کر کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ بین الاقوامی سطح پر ترسیل کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ قومی سطح پر اپنی تہذیبی میراث (Cultural Heritage) کا سروے کر کے اس کے تحفظ کے اقدامات کرنا چاہیے۔ فائن آرٹس (ادب عالیہ) یعنی زبان و ادب، فلسفے مذاہب، تاریخ، فن تعمیر، مجسمہ سازی، مصوری، موسیقی اور ڈرامہ و آرٹ کی تعلیم و تربیت کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ علم شہریت کی تعلیم جذوی یا کلی طور پر ہر طالب علم کو دی جانی چاہیے تاکہ مستقبل میں ایک بہتر شہری بن سکے۔ جمہوری اقدار اور ماحولیاتی تحفظ کی تربیت بھی کم و بیش تمام طلبا کو بہم پہنچانی چاہیے۔

کوٹھاری کمیشن نے اساتذہ کی صلاحیت، قابلیت ان کی پیشہ وارانہ تربیت اور سروس کے معیار کو بلند کرنے پر زور دیا۔ سروس کنڈیشن میں تنخواہ (Pay Scale)، allowances، Retirement Benefit اور Pension کو نافذ کر کے اساتذہ کے سماجی معیار کو بلند کیا جانا چاہیے تاکہ درس و تدریس کے پیشے کی طرف نئی نسل کا رجحان بڑھے۔ کوٹھاری کمیشن کے مطابق یونیورسٹی سطح، اسکولی سطح، یہ تنخواہوں کے الگ الگ اسکیل، ترقی کے مواقع (Promotion) ٹیچر بہبود فنڈ، اور معیار زندگی کے مطابق Retirement allowances, ریٹائرمنٹ کی عمر، 60 سال ہونی چاہیے جس کی توسیع 65 سال تک کی جا سکے۔

اساتذہ کی تربیت کو یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی کا اٹوٹ حصہ بنایا جانا چاہیے۔ کوٹھاری کمیشن نے مختلف سطح کے اساتذہ کی تربیتی پروگرام مثلاً B.Ed.، M.Ed.، B.P.Ed، M.P.Ed اور MA(Education) شروع کرنے کی سفارش کی تھی۔ منتخب یونیورسٹیوں کو ہدایات جاری کی گئی کہ ان کے پاس اسکول آف ایجوکیشن ہونا چاہیے۔ کوٹھاری کمیشن نے تعلیمی ترقی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر سفارشات پیش کیں۔ تعلیمی معیار، داخلہ، تعلیمی مواقع، نصاب اسکول، اسکولی انتظامیہ، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم سائنس و ٹکنالوجی، زرعی تعلیم اور طبی تعلیم اور ایجوکیشنل مینجمنٹ جیسے تعلیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کر کے حکومت کو سفارشات پیش کیں۔

قومی تعلیمی پالیسی۔ 1986 NPE:

انفرادی، سماجی، معاشی اور سائنسی و تکنیکی ترقیاں تعلیم کی مرہون منت ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ان کی صورت حال اور مانگ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ تعلیم اور تعلیمی انتظام میں بھی تنوع پیدا ہونا چاہیے تاکہ بدلتے ہوئے زمانے اور مانگ کے ساتھ دے سکیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ 1964-66 میں پہلی بار ایک جامع تعلیمی کمیشن نے اپنی بہت ہی وسیع اور متنوع سفارشات پیش کیں تاہم سائنسی، سماجی، سیاسی اور آبادی میں اضافے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی میں بھی تبدیلی لائیں۔ اسی ضرورت کے تحت 1986ء میں تعلیمی پالیسی کی تشکیل ہوئی۔ حقیقتاً اس کی داغ بیل 1985 میں ہی پڑ چکی تھی۔ جب حکومت ہند نے تعلیم پر نئی پالیسی تیار کرنے کا اعلان کیا

تھا۔اس نئی تعلیمی پالیسی کے مسودے کو 1986 کے بجٹ اجلاس میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا اور اس پر کافی بحث ومباحثے کے بعد اسے آخری شکل دے دی گئی اور بالآخر اسے عملی جامہ پہنایا گیا۔نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق ہر فرد کی ہمہ جہت ترقی کے لیے تعلیم بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔

تعلیم آزادخیالی، سائنس ٹیمپرامینٹ اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے لازمی چیز ہے جس کے ذریعے سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوری نقطۂ نظر کا فروغ ہوتا ہے۔تعلیم ہی اقتصادیات کی مختلف سطحوں کے لیے انسانی وسائل تیار کرتی ہے۔تعلیم ہی تحقیق وترقی کی بنیاد ہے قومی تعلیمی پالیسی نے تعلیم پر اخراجات کو ایسی سرمایہ کاری سے تعبیر کیا جو حال اور مستقبل دونوں کو سنوارتی ہے۔لہٰذا تعلیم کی بنیاد آئین کے ان اصولوں پر ہونا چاہیے جس کے ذریعے کسی بھی سطح، خطے اور رنگ ونسل کے طلبا کو بلا لحاظ مذہب وملت، ذات پات، جنس اور خطے اور علاقے کی بنیاد پر ایک جیسے تعلیمی مواقع میسر ہونا چاہیے۔سرکاریں ان مقاصد کے حصول کے لیے مناسب رقم موثر ڈھنگ سے خرچ کرسکیں گے، مشترکہ اسکولی نظام قائم کرنے کے لیے بھی مناسب اقدامات کیے جائیں گے جس سے متعلق 1968 کی تعلیمی پالیسی نے بھی سفارش کی تھی۔

پورے ملک میں ایک ہی نظام تعلیم 3+2+10 رائج ہوگا۔اسکولی سطح کے دس (10) سالہ تعلیم پانچ (5) سالہ ابتدائی، 3 (تین) سالہ اعلیٰ ابتدائی اور دو (2) سالہ ہائی اسکول پر منقسم کیا جائے گا۔قومی تعلیمی پالیسی کے مطابق ایک ایسا بنیادی قومی نصاب کا خاکہ تیار کیا جانا چاہیے جو عمومی طور پر مشترکہ ہو اور بعض اعضا لچک دار ہوں تاکہ ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی لائی جا سکے۔مشترک بنیادی نصاب کے حصے میں تحریک آزادی کی تاریخ، آئینی اور شہری ذمہ داریاں اور قومی شخصیت کو فروغ دینے والے مضامین شامل ہوں گے۔اس نصاب کے مضامین میں اقدار، مشترک قومی ورثہ، مساوات، جمہوریت، سیکولرزم، جنسی مساوات ماحولیات کا تحفظ اور سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان خلیج کو ختم کرکے سائنسی مزاج کا فروغ دینا شامل ہوگا۔

عالمی پیمانے پر ہو رہی تبدیلیاں اور بین الاقوامی روابط عالمی بھائی چارا اور قابل بقا ترقی (Sustainable development) کے لیے نصاب میں مضامین شامل ہوں اور انسانی مساوات کو ترجیح دینے والے جذبے کو بیدار کیا جانا چاہیے۔

تعلیم کے ہر مرحلے کا معیار متعین ہونا چاہیے اور چوں کہ ملک کے مختلف حصوں کی سماجی، مذہبی، تاریخی اور تمدنی، وراثتیں الگ الگ ہیں اس لیے ان خطوں اور علاقوں میں ان کے اپنے مزاج کے مطابق مضامین شامل ہونا چاہیے تاکہ قومی ہم آہنگی کا فروغ ممکن ہو سکے۔

قومی سطح پر ایک قومی زبان کا فروغ ہونا چاہیے۔اور اسے رابطے کی زبان کے طور پر فروغ دیا جانا چاہیے اس میں ترجمہ عمومی طور پر اعلیٰ تعلیم اور خصوصی طور پر سائنسی وتکنیکی تعلیم کے طلبا کو ملک کے ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقلی کو آسان بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔اور طلبا کی مطلوبہ قابلیت کی بنیاد پر ملک کے ہر حصے میں ہر معیار کی یونیورسٹیوں/ اداروں میں تعلیم حاصل کرنے اور ایک دوسرے میں انٹرچینج کی سہولت بھی حاصل ہونی چاہیے۔تعلیم تحقیق اور سائنسی ترقی کے اداروں کے درمیان تال میل ہونا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کے وسائل سے استفادہ کرسکے۔تاحیات تعلیم کا مقصد خواندگی انسانی طرز زندگی کی سطح میں سدھار ممکن ہو سکے۔

یوجی سی (UGC)، AICTE اور ICAR اور MCI جیسے معروف اور معزز اداروں کو مزید مستحکم کیا جانا چاہیے تاکہ قومی سطح پر نظام تعلیم کو استوار کرنے میں مدد ملے۔مذکورہ اداروں کے ساتھ NCERT، NUEPA اور International Institute of Science & Technology اور تعلیمی اداروں کے اشتراک کے ذریعے مختلف سماجی، سائنسی اور تکنیکی شعبہ میں تحقیق کو بڑھاوا دینا چاہیے۔

قومی تعلیمی پالیسی نے تعلیم میں سماجی مساوات، خواتین کی تعلیم' درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی تعلیم دیگر پس ماندہ طبقات اور علاقوں کی تعلیم، اقلیتوں کی تعلیم، معذور لوگوں کی تعلیم اور تعلیم بالغان پر بھی مختلف نکات کے ذریعے اپنی سفارش پیش کی ہے۔اس پالیسی نے تعلیم کی مختلف سطحوں کی تنظیم نو مثلاً ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیموں کی تنظیم نو کی سفارش کی ہے۔اس پالیسی نے طفل مرکوز تعلیمی رویہ پر زور دینے اور جسمانی سزا کو ختم کیے جانے کی سفارش کی تھی۔اسکول کی سبھی سطحوں پر انفرااسٹرکچر Infrastructure اور تعلیمی ساز و سامان مہیا کرانے کی سفارش کی ہے۔غیر رسمی تعلیم (Non formal education)، پیشہ ورانہ تعلیم، دیہی یونیورسٹیاں' فاصلاتی تعلیم کو بہتر ڈھنگ سے نافذ کرنے کی بھی سفارش کی ہے۔تعلیمی پالیسی نے تعلیمی انتظام میں ہر سطح قومی، ریاستی اور مقامی سطح پر مختلف شعبوں کے اشتراک کی بات کی ہے۔مالی وسائل کے لیے NPE نے 1968 کی اس پالیسی کا اعادہ کیا جس میں قومی آمدنی کا 6 (چھ) فیصدی تعلیم پر خرچ کیا جائے اور ایسا آٹھویں پنج سالہ منصوبہ میں کر کے دکھایا بھی گیا۔

الغرض NPE نے تعلیم کی مختلف سطح، تنظیم، طریقہ تعلیم طرز تعلیم اور تعلیمی و مالی وسائل پر اپنی جامع پالیسی بنائی تاکہ 21 ویں صدی کے آغاز میں ملک کے ہر فرد کو تعلیمی سہولت میسر ہو سکے۔

رام مورتی Review- کمیٹی 1990:

1986 کے NPE کے اعلان کے بعد اس کے ہر پانچ سال میں اس کی کامیابیوں اور Implementation کا جائزہ لینے کے لیے PoA کی تجویز پیش کی گئی تھی دریں اثنا سطح پر تبدیلی اور حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے اس پالیسی میں تبدیلی کی مانگ کی گئی۔اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر V.P. Singh نے اس مانگ کو سامنے رکھتے ہوئے سری رام مورتی کی صدارت میں 1990 میں، قومی تعلیمی پالیسی 1986 کو review کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔یہی کمیٹی رام مورتی review کمیٹی 1990 کے نام سے جانی جاتی ہے۔اس کمیٹی نے اپنا جائزہ رپورٹ "Towards an Enlightend and Human Society" کے نام سے 26 دسمبر 1990 کو اپنی رپورٹ پیش کی۔اس نے اپنی رپورٹ میں ملک بھر میں تمدنی، اقدار کے تنزلی کی بات کی اور خطرات ظاہر کیے کہ یہ رویہ تعلیمی اداروں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ Review Committee نے نیشنل پالیسی آف ایجوکیشن NPE 1986 کی پیش کردہ تعلیمی پالیسی پر چند موزوں review کیے تھے۔جس میں چند مشورے اس طرح تھے کہ:

پری پرائمری تعلیم Early care Childhood کی ترقی بہت سست ہے۔چنانچہ اس میں تیزی لانے کے لیے آنگن واڑی پروگرام کی ترویج کی جائے تاکہ غریب شیر خوار بچے اور سوسائٹی کے کمزور بچوں کی صحیح دیکھ ریکھ ہو سکے۔کمیٹی نے ابتدائی تعلیم کے زمرے میں تعلیمی پالیسی کے آپریشن بلاک بورڈ (OBB) پروگرام پر تنقید کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اس عشرے میں 50 فی صد اسکولوں کا ہدف مقرر تھا لیکن صرف 30 فیصد اسکول ہی اس پروگرام سے استفادہ کر سکے ہیں۔سکنڈری ایجوکیشن سے متعلق 10+2+3 سسٹم کے تحت جس کی سفارش پالیسی میں کی گئی تھی تنقید کی کہ اب تک بہت ساری ریاستوں میں اسے نافذ نہیں کیا جا سکا ہے۔نودیہ ودیالیہ (Navodaya Vidyalaya) کی سفارش بھی NPE کا حصہ تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ پورے ملک میں N.V. کھولے جائیں گے تاہم review تک 261 اسکول ہی قائم کیے جا سکے تھے۔

اعلیٰ ثانوی سطح پر کثیر جہتی تکنیکی تعلیم Polytechnic 25 فیصد طلبا کو مہیا کرانے کا ہدف مقرر تھا۔جس میں صرف 2.5 فی صد کی تکمیل ہوئی۔رام مورتی review کمیٹی نے ان باتوں کے علاوہ نیشنل پالیسی آن ایجوکیشن کی پالیسی بالخصوص فاصلاتی تعلیم کے زمرے میں

پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کے زمرے میں اساتذہ کی تربیت تعلیم بالغاں، تعلیم میں مساوی مواقع کے متعلق نچلے اور نظر انداز کیے گئے طبقات کی تعلیم اور لینگویج ایجوکیشن پر بھی اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا۔

یش پال کمیٹی 1992:

فروغ انسانی وسائل کی وزارت نے فروری 2008 میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا کام یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن (AICTE) کے رول اور کام کی جانچ کرتی تھی جو ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کمیٹی کے چیرمین معروف سائنس داں پروفیسر یش پال کو بنایا گیا۔ اس لیے اس کمیٹی کو عرف عام میں یش پال کمیٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کمیٹی نے یونیورسٹیوں کے اعلیٰ رول کا جائزہ لیا۔ جن میں اعلیٰ تعلیمی اداروں IITs، IIMs وغیرہ شامل تھے۔ ان اعلیٰ تعلیمی، تکنیکی اور سائنسی اداروں کے نصاب میں اصلاح اعلیٰ تعلیم میں نجی کاری کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن پالیسی 1986 اور POA 1992 کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کمیٹی نے نیشنل کمیشن فار ہائر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ NCHER کے قیام کی سفارش پیش کی۔ NCHER کے قیام کے مقاصد کی تفصیل کو کمیٹی نے بتاتے ہوئے یہ کہا کہ اعلیٰ تعلیم کا پوری طرح Evaluation (جائزہ) لیا جانا چاہیے۔ یونیورسٹیوں کی خودمختاری کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں میں Excellence کا لین دین ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم میں گوڈ گورنینس Good Governance کے زمرے میں شفافیت ہونی چاہیے۔ صنعتی اداروں اور اقتصادی اداروں میں تال میل ہونا چاہیے۔ پورے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کا قومی سطح پر Database تیار کیا جانا چاہیے۔ اور نیشنل ایجوکیشنل ٹریبونل کو قائم کیا جانا چاہیے۔ نیز CBSE کے متعلق مزید فکر و تحقیق کی جانی چاہیے اور نیشنل ریسرچ فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق NCHER میں چیرپرسن کے علاوہ 7 ممبران ہوں گے۔ چیرپرسن اور بورڈ کے ممبران کا انتخاب ملک کے وزیراعظم، پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کا رہنما Opposition (leader) اور عدالت عالیہ کا چیف جسٹس کریں گے۔

قومی تعلیمی پالیسی۔ NPE 2020: اس پالیسی نے سہ لسانی قائدے کو اختیار کرنے پر زور دیا اور کہا کہ "سہ لسانی طریقہ آئینی دفعات، لوگوں، علاقوں، سنگھ کی خواہشات، لسانی نوعیت کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد کے ارتقا کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نافذ کیا جائے گا۔ حالانکہ سہ قاعدے میں زیادہ لچیلا پن ہوگا اور کسی بھی صوبہ پر کوئی زبان تھوپی نہیں جائے گی۔

2.6 مفکرینِ تعلیم (Educational Thinkers)

- ☆ رابندرناتھ ٹیگور
- ☆ سری آروبندو گھوش
- ☆ موہن داس کرمچند گاندھی
- ☆ علامہ اقبال
- ☆ سرسید احمد خان
- ☆ مولانا ابوالکلام آزاد

رابندرناتھ ٹیگور (Rabindranath Tagore)

وشوکوی رابندرناتھ ٹیگور 9/مئی 1861ء میں بنگال (کولکاتہ) کے ایک تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام دیویندرناتھ ٹیگور تھا جو ایک مالدار اور مذہبی شخص تھے۔ ٹیگور کو اسکول نہیں بھیجا گیا۔

1913ء میں اپنے مجموعۂ کلام ''گیتا نجلی'' کے لیے ادب کا نوبل انعام (Nobel Prize) حاصل کیا۔ 1921ء میں ٹیگور نے شانتی نکیتن کے قریب وشوا بھارتی یونیورسٹی قائم کی جو کہ اب ایک سنٹرل یونیورسٹی ہے۔1904 سے 1941 تک ٹیگور نے علم وادب کی خدمت کی اور ہندوستان کو ایک نئی فکر اور نئی جہت عطا کی۔ٹیگور Idealist,Naturalist اور Humanist کے طور پر جانے جاتے ہیں۔اگست 1941 کو ٹیگور ہندوستانی تاریخ پر اپنی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ٹیگور کے مطابق تعلیم کے مقاصد:

ٹیگور کے مطابق تعلیم کے مقاصد مندرجہ ذیل ہونا چاہیے۔

1۔ جسمانی نشوونما

2۔ ذہنی نشوونما

3۔ اخلاقی اور روحانی نشوونما

4۔ زندگی اور تعلیم کے درمیان ہم آہنگی

5۔ ذہن اور روح کی آزادی

6۔ بین الاقوامی جذبے کی نشوونما

ٹیگور کے مطابق تعلیم کا نصاب:

ٹیگور کے مطابق نصاب کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ وہ بچے کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی متوازن نشوونما کر سکے۔مطلب انسان کے روحانی اور سماجی پہلوؤں کی نشوونما ہو سکے۔اس لیے ٹیگور نے نصاب میں مذہب، اخلاقیات،سائنس،سماجی مطالعہ و دیگر مختلف فنون کو شامل کی بات کہی۔ٹیگور طلبا میں تعاون،سماجی ذمہ داریوں کے لیے سماجیانہ کے نشوونما سے طلبا کے اندر خود اظہار کی صلاحیت کو پیدا کرنے کو اہمیت دی، اس کے علاوہ موسیقی، دستکاری کو بھی شامل کرنے کی ترغیب دی۔کل ملا کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے تعلیم کے نصاب میں مذہب، اخلاقیات، زبانیں، ریاضی، سائنس، جغرافیہ،تاریخ وغیرہ مضامین کے ساتھ ساتھ سیر وتفریح،اداکاری، باغبانی،علوم وفنون، دستکاری وغیرہ کو شامل کرنے کی وکالت کی ہے۔

ٹیگور کے مطابق طریقۂ تدریس:

1۔ سرگرمیوں کے ذریعے تعلیم

2۔ خود مطالعے اور تجربات کے ذریعے تعلیم

3۔ بحث ومباحثے کے ذریعے تعلیم

4۔ سیر وتفریح کے ذریعے تعلیم

ٹیگور کے مطابق نظم وضبط:

ٹیگور طلبا کے اندر نظم وضبط چاہتے تھے لیکن وہ مغلوبیت کے اصول کے قائل نہیں تھے اور بچے کو پوری آزادی دینے اور اس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنے کی وکالت کرتے تھے۔جس سے ان کے اندر خود نظم وضبط پیدا ہو۔ٹیگور نے نظم وضبط کے معنی کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ حقیقی نظم وضبط کا مطلب غیر مطلوبہ سمت میں نشوونما سے حفاظت۔نظم وضبط کی اس کیفیت میں رہنا چھوٹے بچوں کے لیے زیادہ مسرت بخش ہوتا

ہے۔ یہ ان کے مکمل نشو ونما میں مدد کرتا ہے۔

ٹیگور کے مطابق اساتذہ کا کردار:

ٹیگور پورے تعلیمی عمل میں اساتذہ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اساتذہ کی مثال ایک ایسی شمع کے طور پر دی ہے، جس کا کام ہے دوسری شمع کو روشن کرنا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اساتذہ صرف مختلف اطلاعات سے طلبا کو لادکر ہی اپنے فرائض کو پورا نہ مان لیں بلکہ اُنھیں زندگی کے مختلف تجربات کے ساتھ منسلک کر کے علم دیں اور تمام مواقع پر اس کی صحیح رہنمائی کریں۔

اپنی معلومات کی جانچ کریں

طویل جوابات کے حامل سوالات؛

(1) ٹیگور کا تعلیمی فلسفہ کیا ہے

(2) رابندر ناتھ ٹیگور کی تعلیمی خدمات کی تفصیل بیان کیجیے۔

(3) ٹیگور کی تعلیمی فکر کن اقدار پر مشتمل ہے وضاحت کیجیے۔

مختصر جوابی سوالات؛

(1) ٹیگور کو کون سے اعزازات حاصل ہوئے۔

(2) شانتی نکیتن کے بارے میں بتایئے۔

خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

(1) ٹیگور کے مطابق تعلیم .... میں دی جائے۔

(2) ٹیگور.................ماحول پسند کرتے تھے۔

(3) ٹیگور کا تعلیم کے .... میدانوں (Areas) میں تعاون رہا۔

(4) ٹیگور کو نوبل انعام................... سال میں حاصل ہوا۔

(5) ٹیگور کی پہلی ادبی تخلیق کا نام............ ہے۔

سری آر بندو گھوش(Sri Aurobindo Ghosh)

حیات و خدمات(1872-1950) :

سری آروبندو گھوش 15 /اگست 1872ء کو کولکاتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام کرشنا دھن گھوش تھا۔ وہ بنگال کے رنگ پور میں اسٹنٹ سرجن تھے اور برہمو سماج کے رکن بھی رہے تھے۔ 1879ء میں سارا خاندان انگلستان منتقل ہو گیا اور وہاں وہ 14 سال تک مقیم رہے۔ ICS کا داخلہ امتحان پاس کرنے کے باوجود وہ اس کورس سے اچاٹ ہو گئے اور 1893 میں ہندوستان لوٹ گئے۔ 1906ء میں وہ بنگال آ گئے اور ایک سیاسی پارٹی میں شامل ہو گئے اور جدو جہد آزادی کا حصہ بن گئے۔ اس دوران انہیں جیل بھی جانا پڑا، علی پور جیل میں قید کے دوران

انہوں نے یوگا کی پریکٹس کی اور یہیں سے ان کی روحانی زندگی کا آغاز ہوا۔ سری آروبندو یونانی، لاطینی، جرمن، انگریزی، سنسکرت کے علاوہ کئی زبانیں جانتے تھے۔1950 میں ان کا انتقال ہوا۔

انضمامی تعلیم(Integral Education):

آروبندو کے مطابق صحیح تعلیم صرف روحانی ہی نہیں بلکہ جسمانی، اہمیت کی حامل اور غور وفکر پر مبنی ہونی چاہیے۔اوپر بیان کیے پانچ تعلیمی اجزا ہی کو Integral Education کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو مکمل ہے، ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے اور آخر زندگی تک جاری رہتی ہے۔ یہ تعلیم نہ صرف انفرادی ارتقا کے لیے کارآمد ہے بلکہ ملک وقوم اور ساری انسانیت کے لیے بھی مفید ہے۔ تعلیم کا قطعی مقصد تمام انسانیت کا ارتقاء ہے اور اس ارتقاء کی اسکیم میں کثرت میں وحدت نشو ونما کا اہم اصول ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو انسان بنانا ہے پہلے ایک آدمی/ بچہ اچھا انسان بنے پھر قوم کا رکن بنے اور پھر خود کی طرف لوٹ آئے۔انسان شہری فرد۔

تعلیم کے مقاصد(Aims of Education):

1۔ تعلیم جدید زندگی کی ضروریات کے مطابق ہو۔ آروبندو نے ایسی تعلیم پر زور دیا جو عصری ماحول سے مطابقت رکھنے والی ہو اور جو ماڈرن زندگی کی ضروریات کو پر کرنے کے قابل ہو یعنی تعلیم فرد کو ایک حرکیاتی شہری بنائے جو موجودہ حالات اور پیچیدہ مسائل کو حل کریں گے۔اسی طرح جسمانی تعلیم، صحت، جسمانی پاکی کی طرف بھی خاص توجہ دینا چاہتے تھے کیوں کہ اس کے بغیر روحانی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔

2۔ دوسرا مقصد حواس خمسہ کی ٹریننگ دینا ہے ۔ بولنا، سننا ، چھونا، سونگھنا اور چکھنا اس کی ٹریننگ اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ چتہ (Chitta)، شعور(Mind)اور مانس(Manas) پاک وصاف ہوں۔ چنانچہ تعلیم کے ذریعے حواس خمسہ کی پاکی حاصل کی جائے۔

3۔ تیسرا اہم تعلیمی مقصد اخلاقی تعلیم ہے۔آروبندو کا ماننا تھا کہ اخلاق اور جذبات کی ترقی کے بغیر صرف ذہنی ترقی انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے۔ایک بچہ کے دل کو اس طرح بنایا جائے کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے بیحد محبت کرے۔ ہمدردی رکھے اور خلوص سے پیش آئے اسی کو اخلاقی ترقی کہتے ہیں۔ یہاں ٹیچر کا رول اہم ہے جو اپنے طلبا کے لیے مثال بنیں تا کہ بچے ان کو دیکھ کر ان کی نقل کریں اور بہترین اخلاق وکردار کا نمونہ بنیں۔

4۔ ذہنی ترقی۔ یہاں ذہنی ترقی سے مراد تمام ذہنی شعبہ جات کی تعلیم کے ذریعے ترقی کو ممکن بنانا جیسے کہ یادداشت،سوچ،غور،سمجھداری، تخیل اور فرق وامتیاز کی تمیز پیدا کرنا۔

5۔ شعوری تعلیم۔شعور بیدار کرنے کے لیے تعلیم کا سہارا لینا نہایت ضروری ہے آروبندو کے مطابق شعور کی چار سطحیں ہیں۔Chitta چتّا یعنی (صحیح یا حقیقی شعور)manas مانس یعنی mind یا ذہن، intelligence یعنی ذہانت اور Knowledge یعنی علم ان کے نزدیک تعلیم کا اہم ترین مقصد روحانیت کی ترقی ہے چوں کہ ہر انسان میں خدائی/ قدرتی عنصر موجود ہے۔اس لیے تعلیم ہی کے ذریعے اس عنصر کی پہچان اور عرفان ممکن ہے۔

تعلیمی نصاب (Curriculum):

آروبندو کی ہدایت تھی کہ بچہ کھلے اور آزاد ماحول میں علم حاصل کرے تا کہ اس کی مخفی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو اور ان تمام

مضامین (Subjects) اور سرگرمیوں کی تجویز رکھی جن کے ذریعے بچوں کی تخلیقی صلاحیتیں باہر آئیں۔ وہ علمی مضامین اور سرگرمیوں میں نئی روح پھونکنا چاہتے تھے تاکہ ایک غیر معمولی اعلی انسان کا بنانا ممکن ہو۔ نصاب کی تدوین کے لیے انہوں نے یہ اصول بنائے۔

(1) نصاب طلبا کی دلچسپی کے مطابق بنایا جائے نصاب صرف کتابوں کی حد تک محدود نہ ہو۔

(2) ذہنی اور روحانی ترقی کو بڑھاوا دینے والے مضامین شامل نصاب ہوں۔

(3) اپنے اطراف واکناف کے علاوہ ساری دنیا کے بارے میں جاننے کا تجسس اور محرکہ طلبا میں پیدا ہوں۔

(4) تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو ابھارنے والا نصاب ہو۔ نصاب انفرادی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو۔

طریقۂ تدریس(Methods of Teaching):

سری آروبندو نے مندرجہ ذیل طریقۂ تدریس پر زور دیا۔

(1) بچوں کو محبت و ہمدردی سے تعلیم دی جائے۔

(2) تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔

(3) تعلیم بچہ کی دلچسپی کے مطابق دی جائے۔

(4) ذاتی تجربے کے ذریعے کرکے سیکھیں (Learning by doing) پر زور دیا جائے۔

(5) معلم اور طلبا کے تعاون کے ذریعے اکتساب کروایا جائے۔

(6) بچے کی تخلیقی صلاحیتوں اور فطرت کے پیش نظر تعلیم دی جائے۔

(7) تعلیم آزادانہ ماحول میں دی جائے تاکہ بچہ اپنی ذاتی کوشش سے زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔

(8) مشاہدے اور بحث ومباحثے کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں۔

اساتذہ کا رول(Teachers Role):

سری آروبندو نے معلم کو اہم مقام دیا ہے لیکن معلم کا کردار مرکزی نہیں ہے انہوں نے صحیح تدریس کا پہلا اصول یہ پیش کیا کہ ''کچھ پڑھانے کی ضرورت نہیں'' مطلب یہ کہ علم بچہ میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ ٹیچر صرف اسے یہ سکھائے کہ وہ علم کو حاصل کیسے کرے، خود اکتسابی کا طریقہ بتائے نا کہ اس پر کچھ مسلط کرے۔ معلم صرف علم کی نشاندہی کرے اور اس کو باہر لانے میں طالب علم کی مدد کرے۔ آروبندو نے ٹیچر کو ایک باغباں سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا کام صرف پودوں (طلبا) کی آبیاری/ رہنمائی کرنا ہے ٹیچر کو ایک یوگی ہونا چاہیے، اس میں ایک صوفی و سنت کی خصوصیات ہونی چاہیے۔ وہ نظم وضبط کا پابند اور ایک مربوط شخصیت رکھتا ہو۔ طلبا کا باریکی سے مشاہدے کرے تاکہ ان کو صحیح راہ بتا سکے۔ پڑھانے کے بجائے تجاویز دے، طلبا کو ذمہ دار فرد بنائیں اور اپنی اندرونی رہنمائی حاصل کرنے میں طلبا کی مدد کریں۔ سری آروبندو طلبا میں خوف پیدا کرنے کے خلاف تھے۔ ان کے مطابق ٹیچر میں علم سے زیادہ اس کے برتاو کی اہمیت ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی (Mohandas Karamchand Gandhi)

حیات وخدمات(1869-1948):

بابائے قوم کی حیثیت سے موہن داس کرم چند گاندھی جی کو ہندوستانی رہنماؤں کی فہرست میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

1920 کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے انہی کی قیادت میں آزادی کے لیے کامیاب جدوجہد کی تھی۔ گاندھی جی ہندوستان کی آزادی کو سماجی تبدیلی (Social Change) کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کا فلسفۂ حیات:

گاندھی جی کا فلسفہ حیات ان کی سچائی (Truth)، انسانیت کی خدمت (Service of Humanity)، عدم تشدد (Non-Voilence)، بے خوفی (Fearlessness)، ستیہ گرہ (Satyagrah) جیسے اعلیٰ تصورات پر مشتمل ہے۔

گاندھی جی کے تعلیمی فلسفے کے بنیادی اصول (Basic Principles of Gandhiji's Educational Philosophy)

گاندھی جی کے تعلیمی فلسفہ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل بنیادی اصول نظر آتے ہیں۔

(1) سات سال سے چودہ سال کی عمر کے تمام بچوں کی تعلیم بلا فیس کے اور لازمی ہونا چاہیے۔

(2) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے۔

(3) طلبا کی تعلیم انگریزی میں نہیں ہونی چاہیے۔

(4) صرف خواندگی کو تعلیم کے برابر نا سمجھا جائے۔

(5) تعلیم اس انداز میں دی جائے کے وہ طلبا کے اندر اخلاقی اقدار کو پیدا کریں۔

(6) تعلیم طلبا کی ان تمام سماجی صلاحیتوں کا فروغ کرے جن کی سماج کو ضرورت ہے کیوں کہ وہ اس کا ایک حصہ ہے۔

(7) تعلیم اس طرح کی ہونا چاہیے کہ وہ بچے کے جسم، ذہن، دل اور روح کی ہمہ جہت فروغ کرے۔

(8) طلبا کو تعلیم کرافٹ یا صنعت کے ذریعے دینا چاہیے تا کہ وہ خود کفیل ہو جائیں۔

(9) تعلیم اس طرح کی دینی چاہیے جس سے طلبا آگے چل کر صاحب روزگار ہو جائیں اور معاشی طور پر آزاد ہو جائیں۔

(10) اسکول کو سرگرمیوں کا ایک مرکز ہونا چاہیے تا کہ وہ مختلف قسم کے تجربوں کو حاصل کر سکیں۔

(11) تعلیم کا مقصد ہے کہ وہ ملک کے شہریوں کو فائدے مند ذمہ دار اور متحرک شہری بنائیں۔

تعلیم کے مقاصد (Aims of Education):

اگر ہم گاندھی جی کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو ان کے نظریے کے مطابق مندرجہ ذیل دو اہم مقاصد ہیں۔

(1) تعلیم کے فوری مقاصد (Immadiate Aims of Education)

(2) تعلیم کا حتمی مقصد (Ultimate Aims of Education)

تعلیم کے فوری مقاصد (Immediate Aims of Education)

گاندھی جی نے تعلیم کے جو فوری مقاصد بتائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اخلاق اور کردار کا فروغ (Promotion of Moral & Character)

گاندھی جی کے فلسفے کا پہلا تعلیمی مقصد تھا طلبا کے اقدار اور کردار کا فروغ کرنا۔ ان کے مطابق تعلیمی عمل میں طلبا کے اقدار اور کردار سب سے اہم ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے اقدار بہت ضروری ہے۔ اگر تعلیم طلبا میں اقدار کا فروغ نہیں کر پاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے تعلیمی نظام میں کچھ کمی ہے۔

ہمہ جہت فروغ (Harmonious Development)

گاندھی جی کے فلسفے کا یہ بہت خاص مقصد ہے۔طلبا کا ہمہ جہت فروغ ہونا چاہیے طلبا میں مختلف قسم کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ان سبھی کا ایک ساتھ فروغ کرنا تاکہ طلبا میں تمام تر صلاحیتیں جمع ہوجائیں۔گاندھی جی ہریجن میں لکھتے ہیں کہ اصل تعلیم وہ ہے جو طلبا کے ذہن، جسم اور روح کو صحیح طریقے سے فروغ کرے۔

ثقافتی مقاصد (Cultural Aim)

گاندھی جی چاہتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے اپنے ملک کی ثقافت کا فروغ ہو اس لیے انہوں نے پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ ثقافتی تعلیم پر بھی زور دیا۔کسی ملک کی پہچان اس کی ثقافت سے ہوتی ہے اس لیے ثقافت کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ہمارے ملک میں تمام صوبوں کی ثقافت الگ الگ ہے اس لیے تمام طلبا کو پورے ملک کے مختلف صوبوں کی ثقافت سے واقف ہونا چاہیے، گاندھی جی کہتے ہیں کی تعلیم کا ثقافتی پہلو علمی پہلو سے بھی زیادہ اہم ہے کیوں کہ ثقافت تعلیم کی بنیاد ہے۔

پیشہ ورانہ مقاصد (Vocational Aim)

گاندھی جی کے مطابق تعلیم کے پیشہ ورانہ مقاصد میں ایک اہم مقصد ہے کہ طلبا جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی اصل زندگی میں داخل ہوں تو وہ اس لائق ہوں کہ اپنی روزی روٹی کما سکیں۔طلبا کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کرافٹ کی تعلیم دینا چاہیے تاکہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی کمپنی میں روزگار حاصل کرسکیں یا اپنی کوئی صنعت قائم کرسکیں۔ان کے مطابق تعلیم ایسی دینی چاہیے جو طلبا کو خودکفیل بنا سکے۔ان کا مقصد طلبا کو مزدور بنانا نہیں تھا بلکہ طلبا کے اندر کام کے احترام کرنے کا جذبہ اور کچھ کمانے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔

علامہ اقبال (Allama Iqbal)؛

حیات وخدمات (1877-1938)

تعلیم کے مقاصد (Aims of Education):

1۔ الوہیت کو سمجھنا:

علامہ اقبال کے مطابق تعلیم کا سب سے اہم اولین مقصد ہے۔خدا کی وحدانیت کا ادراک کرنا اور یہ سمجھنا کہ عبادت کے لائق صرف اسی کی ذات ہے۔

2۔ حق کی تلاش کرنا:

طلبا کو حق یا حقیقت کا ادراک کرنے کا اہل بنانا۔

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو روایتی رسوم و رواج نا سکھایا جایے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ حقائق کو خود تلاش کر سکے۔

3۔ معرفتِ خودی:

یعنی خودی کی تلاش کرنا، یہ علامہ اقبال کا بنیادی فلسفہ ہے اور ان کے تخلیق کردہ سارے ادب کا محور ہی خودی کی تلاش ہے۔بچہ خدا کے بعد اپنے آپ کو جانے، پہچانے اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہونے کی سعی مسلسل کرے اور خودی کو حتی الامکان بلند کرے، اس کے امکانات تلاش

کرے۔

4۔ افزودگی حیات:

اس سے مراد وہ مقصد ہے جہاں فرد ذہانت، استدلال اور ذکاوت کے ذریعے اپنی زندگی کے تصورات (Ideals) کو حاصل کرنے کی طرف رواں دواں رہے اور اپنی زندگی کی با مقصد ترقی میں جٹا رہے۔

نصاب (Curriculum)

1۔ نصاب مذہبی اساس پر مبنی ہو کیوں کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ قرآن کے بعد مسلمانوں کے لیے پرانی تعلیمات کا سر چشمۂ وجدان ہے۔ وہیں سے علم و عمل کی راہیں کھلتی ہیں۔

2۔ تعلیم خود کی پہچان سے شروع ہو، اور خدا کو پہنچانے تک جاری رہنا چاہیے۔ اس کی تشریح کے لیے اس رباعی سے کام لیا جاتا ہے۔

اللہ سے کرے دور ، تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
نا حق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

3۔ نصاب کا قطعی مقصد بچہ کی جملہ صلاحیت کو جلا دینا ہے۔ بچہ کی ہمہ جہتی ترقی ہی پر نصاب مرکوز ہونا چاہیے تاکہ اس کی ممکنہ حد تک ظاہری، جسمانی باطنی، ذہنی و روحانی ترقی کا احاطہ ہو سکے۔ بچے میں آگے بڑھنے کی لگن پیدا ہو۔

4۔ نصاب طلبا میں سوز دروں، پیدا کرنے والا ہو۔ تخلیقی سرگرمیاں اور جہد مسلسل انسان میں دنیاوی چیلینجس کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔

5۔ تمام اقوام میں مذہب اہمیت رکھتا ہے چنانچہ اگر علم کو مذہب کے زیر اثر نہ رکھا گیا تو وہ باطل قوت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لیے سائنس کا علم ضرور حاصل کیا جائے۔ لیکن ایک ذمہ داری کے ساتھ تاکہ اس کے غلط اور ناروا استعمال سے انسانیت محفوظ رہے۔ مذہب اور سائنس وٹکنالوجی میں توازن نہ ہو تو وہ ناعاقبت اندیشی کی طرف لے جاتا ہے۔

طریقۂ تدریس (Methods of Teaching) :

1۔ اقبال روایتی طریقۂ تدریس کے خلاف تھے۔ نئے انداز و نئے مضامین کو شامل کرنے کے متمنی تھے اور مشاہدے کو تدریس کا اہم جز مانتے تھے۔

2۔ تعلیم کو کتابوں تک محدود رکھنے کے سخت مخالف تھے۔

3۔ سوال وجواب کا طریقہ۔ علامہ اقبال سوال وجواب کے طریقۂ تدریس کے حامی تھے۔

4 معلم کا کردار۔ علامہ اقبال کے یہاں استاد کا رتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اساتذہ کو سماج کے با اثر طبقے میں شمار کرتے ہیں۔ معلم ایسے ہوں جو سماج وانسانیت میں نئی روح پھونکے اور ایسی نسل تیار کریں جو دنیا کا رخ بدل دے۔

5۔ نظم وضبط۔ طلبا سنجیدگی کے ساتھ علم حاصل کریں۔

اپنی معلومات کی جانچ کریں

1۔ علامہ اقبال کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ علامہ اقبال کے تعلیم کے کیا مقاصد ہیں؟

3۔ علامہ اقبال کے یہاں معلم کا کیا رول ہونا چاہیے؟

4۔ طریقۂ تدریس علامہ اقبال کے مطابق کس طرح کا ہونا چاہیے؟

مولانا ابوالکلام آزاد (Maulana Abul Kalam Azad)

حیات وخدمات (1888-1958)

آج ہماری قوم اخلاقی، سیاسی، معاشی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے اور جو ملک کو حالات درپیش ہیں ان سے ساری قوم واقف ہے۔ ایسی صورتحال میں اور ملک کو ترقی، خوشحالی، امن وامان اور باہمی یگانگت کی راہ پر ڈالنے کے لیے مولانا آزاد کی شخصیت وافکار وخیالات سے روشنی حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ خیالات وافکار ملک وقوم کے روشن مستقبل کی ضمانت دیتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت میں فکر وعمل یکجا ہوگئے تھے اور جب یہ دونوں یکجا ہوتے ہیں تو فکر ونظر کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور انقلاب اور تبدیلی کے لیے زمین ہموار ہوجاتی ہے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی افکار:

یہ اظہر من الشمّس ہے کہ مولانا آزاد ہمیشہ سے اصلاح پسندی کے حامی اور قائل تھے۔ وہ صرف اصلاح باطنی ہی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ دنیاوی امور میں بھی شفافیت اور انسانی خدمت واقتصادی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ انہوں نے اپنے دانشورانہ تصورات کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ چنانچہ جو تعلیمی نظام کا ڈھانچہ انہوں نے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے قائم کیا تھا وہ آج بھی بغیر کسی بڑی تبدیلی کے بعینہ موجود ہے۔ لیکن خصوصیت سے انہوں نے مذہبی تعلیم پر بہت زور دیا۔ لیکن انہوں نے مذہبی قدامت پرستی اور توہم پرستی سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ اور قرآنی تعلیمات پر مبنی تعلیم کی اہمیت واضح کی، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اخلاق، کردار، افکار واعمال صحیحہ کے ذریعہ اسلام کا سچا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہی سوچ اور فکر پوری ہندوستانی قوم کے حوالے سے بھی رکھتے تھے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات وتصورات ان کی علمی، ادبی، صحافتی ومذہبی تحریروں میں ملتے ہیں۔ اپنی تحریروں اور خطبات اور ان کی بنائی ہوئی تعلیمی پالیسیوں کے ذریعہ ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچہ کی تشکیل کی ہے۔

ثقافتی نظریات:

مولانا آزاد ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظام چاہتے تھے جو یہاں کی تہذیب وثقافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کو پورا کرے۔ اور ساتھ ہی دوسرے ممالک کے کلچر سے نفرت بھی نہ پیدا ہو بلکہ اس نظام کی خوبیوں کو شامل نصاب کرنے کی گنجائش بھی ہو۔

مہاتما گاندھی نے 1937 میں بیسک ایجوکیشن (Basic Education) کا جو تصور پیش کیا تھا مولانا آزاد بھی اس سے متفق تھے جس کا بنیادی مقصد دیہی عوام کو روزگار فراہم کرنے مواقع پیدا کرنا تھا۔ مولانا آزاد نے بھی اسی طرز پر تعلیم برائے روزگار اور حرفہ مربوط تعلیم

(Technical Education) پر خصوصی توجہ دی اور ابتدائی تعلیم کے فروغ کے لیے ایسا تعلیمی نقشہ بنایا جو کم وبیش آج بھی ہندوستان میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ موجود ہے۔

نظریہ افادیت اور مولانا آزاد:

وہ تعلیم میں نظریہ افادیت (Pragmatism) کے بھی حامی تھے۔ منجمد خیالات ونظریات کے برخلاف انہوں نے ہر نئی اور اچھی تبدیلی کو کھلے دل سے قبول کیا، زمانے کی ترقی اور افکار نو کا استقبال کیا اور اپنے تعلیمی نظریات میں بھی لچک پیدا کی۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کو اسلامی اساس پر مبنی دیکھنا چاہتے تھے تو دوسری طرف اس تعلیم کو عصری تقاضوں پر پورا اترتے بھی دیکھنا چاہتے تھے، وہ تعلیمی نظام کو عصری ماحول اور جدیدیت سے مطابقت رکھنے والا بنانا ضروری سمجھتے اور خواہاں تھے کہ طلبا متحرک، صنعت وحرفت کے ماہر اور باعمل زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔ عام روایتی تعلیم کے ساتھ غیر رسمی تعلیم، تعلیم بالغان اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے فروغ کا بھی واضح نظام انہوں نے پیش کیا۔ ان کے پیش نظر قوم کی ترقی اور ملک کی سالمیت ہمیشہ سے رہی۔ چنانچہ وہ تعلیم کے جمہوری اور سیکولر کردار کے حامی تھے اور اس کو عصری بنانے اور زندگی سے جوڑنے کی کوششیں بھی کیں۔

وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مولانا آزاد نے ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے تعلیمی مقاصد اور قومی تشکیل کے بارے میں کہا:

> ''مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیے''

مدرسوں میں عربی تعلیم کی کوتاہیوں کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

> ''آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو زمانہ کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں۔ زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا اور آپ وہیں رہے، جہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کو زمانہ کے تقاضوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا اور زمانے نے آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا''۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایسی اصلاحات کو مروج کرنا چاہتے تھے جس میں مذہبی اور عصری دونوں کے نصاب کی خامیاں دور ہوں اور جو اقتصادی ترقی اور عصری ماحول سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ماقبل آزادی، ہندوستان کی بڑی آبادی ناخواندہ تھی اور ابتدائی تعلیم کے فروغ میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی تھی۔ سماج کا بہت بڑا طبقہ علم سے محروم تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد کی فکر نے ایک تعلیم بالغاں کا نیا باب کھولا۔ ان کے ذہن رسا نے یہ سوچا کہ جب تک والدین تعلیم یافتہ نہ ہوں یا خواندہ نہ ہوں وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایسی تعلیم مہیا کروائی جائے بالغ افراد کی دسترس میں ہو۔ مولانا آزاد نے تعلیم بالغان کا نیا تصور پیش کیا جس کے تحت بالغ خواندگی کا آغاز ہوا۔ سماجی تعلیم (Social Education) کے عنوان سے بالغ افراد کو خواندہ بنانے کے لیے ایک منظم تحریک چلائی گئی جس کا مقصد ناخواندہ افراد کو اپنی سہولت کے مطابق تعلیم حاصل کروانا اور ان کی پیشہ وارانہ مہارت اور اس سے متعلق معلومات فراہم کرنا اور تعلیمی وسائل مہیا کرنا تھا۔ اور اس کے لیے ایسے مقامات پر خواندگی مراکز کھولے گئے جہاں ناخواندہ بالغان کی کثیر تعداد موجود تھی۔

ان مقاصد کے علاوہ سماجی تعلیم کا اہم مقصد ناخواندہ بالغوں کو اجتماعی زندگی میں حصہ لیتے ہوئے سماج کا حصہ بننے کی ترغیب دینا، کسی پیشہ کے لیے تیار کرنا اور سماجی شعور بیدار کرنا تھا۔ اس تعلیمی پروگرام کے نصاب میں درسی مواد کے علاوہ شہریت، حفظان صحت، غذا اور تغذیہ، سائنسی سوجھ بوجھ، پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافہ، سماجی، طبی، ماحولیات اور روزمرہ کی زندگی کے لیے کارآمد معلومات کی فراہمی بھی شامل تھی۔

علاوہ ازیں تعلیم بالغان میں تہذیبی وثقافتی پروگراموں میں حصہ لینے کا اہل بنانا شامل تھا تاکہ اس کے ذریعہ تعلیم کو عام دھارے سے مربوط کیا جاسکے۔

مولانا کا تعلیمی پالیسیوں سے متعلق نظریہ:

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسیوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آزاد ہندوستان میں تعلیم کے چار اہداف کی نشاندہی کی۔ جوکہ حسب ذیل ہیں۔

(1) تحتانوی سے ثانوی درجہ تک تعلیم کی فراہمی کے ذریعہ ناخواندگی کا خاتمہ۔ تعلیم بالغاں پر خصوصی توجہ بشمولِ خواتین۔

(2) تعلیم کے یکساں مواقع جمہوری اساس پر فراہم کرنا بلالحاظ مذہب وملت، فرقہ، درجہ، رنگ ونسلی امتیاز کے۔

(3) سہ لسانی فارمولہ پر عمل کرنا۔

(4) ملک کے طول وعرض میں تحتانوی سطح کی تعلیم کا فروغ۔

مولانا کا نظریہ تھا کہ حصولِ علم ہر فرد کا بنیادی حق ہے جو انسانی بقا وترقی کے لیے نہایت اہم ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ ملکی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب کے لیے ثانوی درجہ تک تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرے۔

مولانا آزاد کے پیش کردہ انہی تعلیمی تصورات کی بنا پر آج سارے ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم زور وشور سے جاری ہے اور ملک کے ہر علاقے میں یہ پھیل چکی ہے۔ مولانا نے تعلیم بالغان کو سماجی تعلیم سے موسوم کرتے ہوئے اس کے تین اہم مقاصد متعین کیے تھے جو حسب ذیل ہیں۔

(1) ان پڑھ بالغوں کو پڑھانا

(2) معمولی خواندگی رکھنے والے بالغ افراد کو فنی، ادبی اور پیشہ ورانہ اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا۔

(3) بالغ افراد کو زندگی کے مسائل سے واقف کروانا اور ان کے حقوق کے بارے میں بیداری پیدا کرنا۔

اس نصاب میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی کہ ملک کا ہر شہری سماجی وسیاسی حالات سے واقف ہو۔ جس خطہ پر وہ رہتے ہوں اس کے گرد وپیش کے حالات وہاں کی حکومت اور حکومت بنانے کے لیے حق رائے سے استفادہ کرنے کا بھی اہل بنے۔

تعلیمی خدمات:

مابعد آزادی مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات نے ٹھوس شکل اختیار کرلی اور ہندوستان ان کی بیش بہا تعلیمی خدمات کا بھی مرہون منت ہے۔ یوں تو ان کے بیشمار کارنامے شعبۂ تعلیم کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں چند ایک انتہائی اہمیت کے حامل اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا راست تعلق ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچہ سے ہے جو ادارے، کمیشن، کونسلس، بورڈس، بیوروز، مولانا کے دوران وزارت قائم کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(1) CABE۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (Central Advisory Board of Education) کا قیام 1948 میں عمل میں لایا گیا۔

(2) یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن (University Education Communication) کا قیام

(3) سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کا قیام (CBSE)

(4) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) وغیرہ کا قیام مولانا آزاد کی اہم ترین تعلیمی خدمات میں شامل ہیں جس کے ذریعہ انہوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو عملی شکل دی۔

(5) آل انڈیا کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن کی مولانا نے ازسرنو تشکیل کی اور کھڑگ پور میں تکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا۔

(6) یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن (University Education Commission) کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لیا گیا اور اصلاحات کی گئیں۔ اسکول ایجوکیشن اور خاص طور پر ثانوی تعلیم کے لیے مدلیار کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ آزاد ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ایسے بیشمار اداروں کا قیام مولانا آزاد کی دوراندیشی کے نتیجہ میں عمل میں آیا جس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ سماجی تعلیم سے متعلق مولانا کی تقریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''ہم سب اپنی قسمت کے معمار ہیں، آج ہم کو ہمارے گھر کو سنبھالنا ہے اور ان حصوں کو جو توجہ چاہتے ہیں، درست رکھنا ہے۔ قومی نظام تعلیم، قومی زندگی کے لیے ایک لازمی ضرورت ہے''۔

(7) آل انڈیا کونسل فار سیکنڈری ایجوکیشن (All India Council for Secondary Education):
کونسل کا قیام مختلف ریاستوں میں تال میل قائم رکھنے کے لیے کیا گیا۔

(8) تعلیم بالغاں (Adult Education)
ناخواندہ بالغ افراد میں تعلیمی فروغ کی غرض سے یہ بورڈ قائم ہوا۔

(9) Rural Higher Education: دیہاتی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے یہ بورڈ قائم کیا گیا۔

(10) Central Social Development Board

(11) Educational & Vocational Guidance Bureau

(12) National Organization for Basic Education : اس ادارے کے تحت بنیادی تعلیم، ہنرمندی اور روزگار سے مربوط مہارتیں پیدا کرنا تھا۔

اس کے علاوہ بھی مولانا نے تعلیمی میدان میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو تفصیل کے متقاضی ہیں۔

مختصراً یہ کہ مولانا نے کئی ایک پروگرامس ہندی کے فروغ کے لیے بنائے اور منعقد کیے جب کہ وہ قومی زبان قرار دے دی گئی۔ مولانا چاہتے تھے کہ بجائے انگریزی زبان کو مقامی زبانوں پر ترجیح دینے کہ ہندوستانی، زبان کو مروج کیا جائے۔ ہندی اور اردو زبان کے امتزاج سے ہندوستانی، زبان کی تشکیل کی انہوں نے تجویز رکھی تھی جو مسترد کر دی گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ علاقائی سطح پر مادری زبان کا فروغ ہو اور قومی سطح پر ہندوستانی زبان رائج ہو۔

علاوہ ازیں متعدد سکیمات بنائی گئیں، جسمانی صحت کے لیے۔ تعلیمی تفریحات کے لیے، ترقی نوجوانان کے لیے، سماجی خدمات کے لیے اور تعلیم برائے معذورین کے ضمن میں۔ اس کے علاوہ مولانا نے ہندوستان کی ہمہ جہتی ترقی کے پیش نظر تین (3) اکیڈمیاں قائم کیں۔ (1) ساہتیہ اکیڈیمی (2) للت کلا اکیڈیمی (3) سنگیت ناٹک اکیڈیمی۔

مولانا آزاد کی سرکردگی میں وزارت تعلیم نے ایک نیا شعبہ ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لیے بنایا جس کے ذریعے UNESCO اور دوسرے بین الاقوامی ثقافتی اداروں سے رشتہ قائم ہوا۔ ایک اور ادارہ طلبا اور اساتذہ کے درمیان ڈائیلاگ اور اپنے اپنے نقاطِ نظر کو پیش

کرنے کے مقصد سے قائم ہوا۔ان تمام اداروں کے قیام میں لگن اور دلچسپی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ایک قوم پرست قائد تھے اور اتحاد، آپسی دوستی اور اخوت کے علمبر دار تھے۔

مولانا آزاد کے مطابق تعلیم کے مقاصد:

مولانا آزاد تعلیم کے ذریعے انسان کی ہمہ جہت ترقی چاہتے تھے۔وہ تعلیم کو روزی روٹی حاصل کرنے کا ذریعہ مانتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ہمہ جہت ترقی کا بھی ایک آلہ سمجھتے تھے۔وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ایسی ہو جس سے انسان کی اخلاقیات اور روحانیات کی نشو ونما ہو۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے ذریعے لوگوں کو ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شہری بنانا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ طلبا کے اندر حب الوطنی کا جذبہ اور جدت پسندی کی وکالت کی۔وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ تعلیم ایسی ہو جو کہ اپنی ثقافت، رسم ورواج اور علم پر فخر کرنا بھی سکھائے۔

مولانا آزاد کے مطابق تعلیم کا نصاب

مولانا آزاد تعلیم کے نصاب میں مشرقی ومغربی دونوں طرح کے مضامین چاہتے تھے اور نصاب میں مختلف زبانوں، تاریخ، جغرافیہ، سماجی علوم، ریاضی الجبرا، سائنس ٹکنالوجی اور جدید علوم کو شامل کرنا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ پیشہ وارانہ اور حرفتی (Vocational) مضامین کو شامل کر کے طلبا کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کہی۔ان کا ماننا تھا کہ نصاب ملک کے حالات اور وقت وضرورت کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے۔

سر سید احمد خان (Sir Syed Ahmad Khan)

حیات وخدمات(1817-1898)

سر سید احمد 17 اکتوبر 1817 کو دلی میں پیدا ہوئے، وہ دہلی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے مورث اعلی ہرات سے جہان آباد آئے تھے۔سید احمد کا ننیہالی تعلق اردو کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے خاندان سے تھا، سید احمد کی تعلیم کا آغاز روایتی انداز میں ہوا۔سر سید نے ہندوستان کی ذہنی پستی کو ایک نئی تعلیمی ادراک اور نئے نقطۂ نظر سے دور کرنے کی سعی کی۔وہ دیسی زبانوں میں مغربی ترجموں کو لانا چاہتے تھے، چنانچہ اس مقصد سے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور 1866ء میں انسٹیٹیوٹ گزٹ نکالا اس گزٹ نے مضمون نگاری میں بہت اہم رول ادا کیا، بعد میں سر سید نے 'تہذیب الاخلاق' رسالہ جاری کیا جس کی وجہ سے مقالہ نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس میں سر سید اور دوسرے ادبی ذوق رکھنے والے، اخلاقی، اصلاحی اور مذہبی مضامین لکھتے رہے۔

تعلیم کے مقاصد (Educational Aim)

سر سید کے مطابق ''انسان کی تعلیم درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں بلکہ دل کے سوتوں کو کھولنا ہے جو اندرونی قوت کو حرکت میں لانے اور شگفتہ وشاداب کرنے سے نکلتا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان کی تربیت کرنا، اس کے لیے سامان مہیا کرنا اور اس سے کام لینا ہے۔ان کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا، انہوں نے واضح کیا کہ علم کے معنی 'جاننے' کے ہیں اور تعلیم کو فائدہ مند ہونا چاہیے، ایسی تعلیم جو دین و دنیا دونوں کے لیے مفید ہو۔وہ مغربی تعلیم کو سائنسی علوم کے حصول کے لیے ضروری سمجھنے اور اس کے تجربی ہونے کے قائل تھے عوامی تعلیم کے خواہاں تھے جہاں پڑھنے لکھنے کی سہولت حاصل ہو وہ انفرادی کی بجائے قومی تعلیم کے خاہاں تھے۔اجتماعی اور قومی تعلیم کا جو تصور آج عام ہے ان کے زمانے

میں بالکل نیا تھا لیکن سرسید نے ان کی معنویت محسوس کر لی تھی۔ وہ مروجہ تعلیم جو کہ کتابی و روایتی ہوا کرتی تھی کو غیر مفید مانتے تھے تعلیم ایسے انسان بنائے جن میں قومی، وطنی، اور ملی شعور بیدار ہو اور یہ صرف لائق اور صاحب کردار اساتذہ کی نگرانی ہی میں ممکن ہے۔ انہوں نے لارڈ میکالے کی تعلیمی کو پسند کیا، سرسید نے تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑا اور اسے معاشی آسودگی کا ذریعہ قرار دیا۔ صرف سرکاری ملازمتوں پر قناعت کرنے کے بجائے وہ چاہتے تھے کہ عوام تجارت اور دوسرے پیشوں کو بھی ترجیح دیں۔ اعلیٰ تعلیم کے متمنی بھی تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس جلسہ منعقدہ 1887ء لکھنؤ میں اعلی انگریزی تعلیم پر انہوں نے زور دیا اور قوم کو مائل کیا۔ ان کی انتھک کوششوں سے قائم کردہ مدرسۃ العلوم میں رائج الوقت علوم کی تعلیم کے علاوہ اور نصاب پڑھائے جانے کے علاوہ طلبا کی معلومات کو وسیع کرنے کے مقصد سے علما کے توسیعی خطبات بھی مختلف موضوعات پر ہوا کرتے تھے، مضمون نگاری کے مقابلے تقریری مقابلے، طلبا کے ذہنی، اخلاقی اور جسمانی نشو نما کے لیے کھیل کود کے کلب تھے جہاں طلبا اساتذہ کی نگرانی میں ادبی ذوق کے علاوہ فٹ بال، کرکٹ، گھڑ سواری، نیزہ بازی، جمناسٹک، بنوٹ، لان ٹینس، وغیرہ میں حصہ لیتے، مختلف قسم کے کھیلوں کے علاوہ طلبا کو انگریزی طرز پر فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

تعلیم نسواں (Women's Education)

سرسید احمد خان تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے، انہوں نے کہا تھا کہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی بنیاد ہے چنانچہ کافی ردو قبول کے بعد کئی پیچیدہ مراحل سے گذر کر 19 اکتوبر 1904ء میں لڑکیوں کا پہلا مدرسہ علی گڑھ میں قائم ہوا۔ خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک رسالہ 'خاتون' بھی جاری کیا گیا جس کی وجہ سے عوام میں تعلیم نسواں کے متعلق شعور پیدا ہوا 1916-17 میں لڑکیوں کے لیے بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا گیا۔ بعد میں گرلس ہائی اسکول 1929 میں انٹرمیڈیٹ ہو گیا۔ 1935 میں بی اے کی کلاسیس شروع ہو گئیں، اس طرح تعلیم نسواں کا کارواں چل پڑا۔

سرسید کے مطابق نصاب(Curriculum)

سرسید کی زندگی کا مقصد ہی تعلیم کی ترویج رہی ہے لیکن وہ فرسودہ تعلیم اور نصاب کے خلاف تھے وہ تعلیم اور نصاب کی جدید کاری کے قائل تھے تعلیم کے ذریعے سماجی اصلاح ان کا مقصد تھا، سائنس و انگریزی علوم کو وہ نصاب کا ضروری حصہ بنانا چاہتے تھے اس مقصد سے انہوں نے کئی ادارے، سوسائٹیاں، کلبس، کانفرنس، میٹنگ، رسائل، اخبار قائم و جاری کیے اور علم جدید کے اشاعت کی ترغیب دی۔ وہ نصاب کو عقلیت پر مبنی، ماڈرن، ہمہ جہت اور حالات سے میل رکھنے والا، وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانا چاہتے تھے۔ علمی میدان میں یوروپی ممالک کی برابری کرنا بھی ان کا مقصد تھا۔ لیکن وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی حدود کے بالکل خلاف نہیں تھے انہوں نے ساری زندگی علوم دینیہ کی بھی خدمت کی۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ وہ دنیاوی اور جدید علوم کو شامل نصاب رکھنا چاہتے تھے۔ کھیل کود، مصوری، و دیگر فنون لطیفہ، تحریری و تقریری صلاحیت پیدا کرنا بھی نصاب کا مقصد ہونا چاہیے۔ 1886 میں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا عین مقصد سائنسی علوم کو اردو زبان میں ترجمہ کرنا تھا، مغربی علوم کی اہمیت ان کے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ قومی یک جہتی کے علمبردار رہے نصاب کو محدود رکھنے کے خلاف تھے اور تہذیبی اور اخلاقی تعلیم بھی ان کے یہاں طلبا کی روزمرہ کی ٹریننگ کا حصہ تھیں۔ سیکولر نصاب بھی ان کی اولین ترجیح تھی۔

اساتذہ کا رول(Role of a Teacher)

سرسید کے مطابق اساتذہ کا رول غیر معمولی ہے۔ ان کے مطابق اساتذہ اپنی علمی قابلیت کے علاوہ تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہوں وہ چاہتے تھے کہ اساتذہ اپنا ایسا تاثر طلبا پر چھوڑیں کہ وہ تا عمر ایک مثالی اور عمدہ شخصیت کا نمونہ پیش کریں۔ سرسید احمد خان بذات خود بھی تمام عمر

لکھنے پڑھنے میں ہی مصروف رہے۔شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ بے شمار مضامین اور مختلف النوع موضوعات پر انہوں نے لکھا اور عوام میں لکھنے کا ذوق پیدا کیا، رسالے شائع کیے، رپورٹیں لکھیں، وہ بہتریں مقرر بھی تھے جید عالم، رہنما، مصلح قوم، ان کی ذات ایک ایسا منبع نور تھی جس کے ہر گوشے سے علم کے سوتے پھوٹے پڑتے تھے بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم ہندستانیوں میں جدید علوم کی طرف رغبت پیدا کرنے میں ان کا تعاون غیر معمولی اور مثالی رہا ہے۔

2.7 یادرکھنے کے نکات (Points to Remember)

تعلیم کا مقصد فرد اور سماج کی ہمہ جہت ترقی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی تہذیب وثقافت زمانہ قدیم ہی سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔اس طرح یہاں کے نظام کو بھی ایک منفرد حیثیت حاصل رہی ہے۔

دورِقدیم میں ویدوں اور بودھوں کے دور میں اگرچہ بنیادی اہمیت مذہبی تعلیم کو حاصل رہی ہے لیکن اپنے مقصد کے اعتبار سے شخصیت کی ہمہ جہتی ترقی پر زور دیا جاتا ہے۔

اسی طرح عہد وسطیٰ اور مسلم دور میں بھی مذہبی تعلیم کو ترجیح دینے کے باوجود اس وقت کے عصری علوم پر بھی توجہ دی گئی۔طب منطق، خیاطی، خوش نویسی اور دیگر علوم وفنون کو شامل نصاب رکھا گیا۔اس دور کی ایک خوبی یہ بھی رہی کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے تعلیمی ادارے متوازی طور پر قائم اور کارکرد رہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے جو تعلیمی نظام متعارف ہوا اس میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی اہمیت کم کردی گئی اور مغربی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ قبول کیا گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد جمہوری طرزِ حکومت کے ساتھ لازمی طور پر ہمارے نظام تعلیم کا مقصد بھی جمہوری اور سیکولر شہری تیار کرنا ہے۔

2.8 فرہنگ (Glossary)

الفاظ	معنی
دورِقدیم (Ancient Period)	اس دور سے یہاں ویدوں اور بودھوں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا گیا ہے۔
دورِوسطیٰ (Medieval Period)	یہ دور مسلم دورِحکومت بھی کہلاتا ہے۔ اس میں بطور خاص سلاطین اور مغلوں کے دور پر توجہ کی گئی ہے۔
دورِجدید (Modern Period)	اس دور میں مسلم دورِحکومت کے بعد کی تاریخ شامل ہے جس میں آزادی سے پہلے برطانوی حکومت اور آزادی کے بعد کا جمہوری دور دونوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
گروکل (Gurukul)	ویدوں کے دور کی تعلیم گاہ جو استاد کا گھر بھی ہوتا تھا اور یہاں طلبا حصول علم کے ساتھ قیام کرتے تھے۔
مدرسہ (Madarsa)	مسلم دورِحکومت کے وہ تعلیمی ادارے جہاں مذہبی اور عصری علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

2.9 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں (Unit End Activities)

معروضی جوابات کے حامل سوالات ؛

1- لفظ وید جس لفظ وِد سے ماخوذ ہے اس کے معنیٰ ___________ ہے۔
2- ویدوں کے دور میں 48 سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے والے شخص کو ___________ کہا جاتا ہے۔
3- ___________ نظام تعلیم میں سنگھ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔
4- مسلم دور حکومت میں بچوں کی تعلیم کا آغاز ___________ سے ہوتا تھا۔
5- ___________ کا قیام 1902ء میں عمل میں آیا۔
6- علامہ اقبال اپنے فلسفے ___________ کی وجہ سے معروف ہیں۔
7- مولانا آزاد کے مطابق مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور ___________ ہونا چاہیے۔
8- ٹیگور نے ___________ ماحول میں تعلیم وتدریس کی بات کہی ہے۔

جوابات:

1- علم	2- آدنیہ	3- بودھ
4- مکتب	5- انڈین یونیورسٹی کمیشن	6- خودی
7- انسان دوستی	8- فطری	

مختصر جوابات کے حامل سوالات ؛

1- ویدوں کے دور کی تعلیم کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔
2- بدھ دور میں تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
3- اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4- عہد وسطیٰ میں تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
5- درج ذیل مفکرین کے تعلیمی افکار پر مختصر روشنی ڈالیے۔

1- سی اربندو گھوش	2- موہن داس کرم چند گاندھی	3- سر سید احمد خان
4- علامہ اقبال	5- رابندر ناتھ ٹیگور	6- مولانا ابوالکلام آزاد

طویل جوابات کے حامل سوالات ؛

1- ویدوں کے دور اور بدھ دور کے تعلیمی نظام کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

-2 ''مسلم دور میں مدارس میں مذہبی تعلیم کے علاوہ اس دور کے جدید مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے''۔ تفصیلی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

-3 ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دور میں تعلیم کے مقاصد بہت ہی محدود تھے،اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔تفصیل سے لکھیے۔

-4 ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ پیش کیجیے۔

2.10 تجویز کردہ مواد(Suggested Readings)

-1 ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم (ساجد جمال،عبدالرحیم)

-2 شکشا کی درشنک پرشٹھ بھومی (ڈاکٹر لکشمی لال کےاور۔ جے پور)

3-Philosophical and Sociological Perspectives on Education (J.C. Agarwal Shipra Publications, Delhi)

4-Philosophy of Education-2014 (Santosh Vallkat, APH Publishing House, New Delhi)

5-Foundation of Education (2006) - (Ghanta Ramesh, Dash B.N., Neel Kamal Publication)

اکائی 3۔ مشرقی نظام اور مغربی فلسفۂ مکاتب

(Eastern System and Western Schools of Philosophy)

اکائی کے اجزا؛

3.1 تمہید (Introduction)

3.2 مقاصد (Objectives)

3.3 فلسفۂ مشرقی نظام (Philosophy of Eastern Systems)

3.3.1 سانکھیہ (Sankhya)

3.3.2 یوگا (Yoga)

3.3.3 نیایا (Nyaya)

3.3.4 صوفی ازم (Sufism)

3.4 مغربی فلسفۂ مکاتب (Philosophy of Schools Western)

3.4.1 تصوریت (Idealism)

3.4.2 فطریت (Naturalism)

3.4.3 عملیت (Pragmatism)

3.4.4 وجودیت (Existentialism)

3.5 یادر کھنے کے نکات (Points to Remember)

3.6 فرہنگ (Glossary)

3.7 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں (Unit End Activities)

3.8 تجویز کردہ مواد (Suggested Readings)

3.1 تمہید (Introduction)

اس سے قبل آپ اس بات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ ہندوستانی نظام تعلیم زمانہ قدیم ہی سے اپنی گونا گوں خصوصیات کے باعث دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ویدک دور سے لے کر بودھ دور اور عہد وسطیٰ سے لے کر عہد جدید تک ہمارے نظام تعلیم نے تبدیلی اور ارتقا کے مختلف مراحل پار کیے ہیں۔ ارتقا کے اس عمل میں مفکرین کے افکار و خیالات اور ان کی خدمات کا مطالعہ بھی آپ کر چکے ہیں۔

اس اکائی میں آپ دیکھیں گے کہ ہمارے نظام تعلیم کو زمانہ قدیم میں متاثر کرنے والے ہندوستانی فلسفے میں بھی چند واضح مکاتب فکر رہے ہیں۔ ان میں سانکھیہ فلسفہ، نیایا اور یوگا شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد اسلامی افکار اور مقامی خیالات کے امتزاج سے جنم لینے والے فلسفہ تصوف کو اس اکائی میں شامل کیا گیا ہے۔

3.2 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ قدیم بھارت کے فلسفیانہ نظام سے تصوف کی اہم خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں۔

☆ قدیم بھارتی فلسفوں میں سے سانکھیہ، یوگا، نیایہ اور صوفی ازم کا تفصیلی تعارف کروا سکیں۔

☆ سانکھیہ، یوگا، نیایہ اور صوفی ازم فلسفہ اور تعلیم کے ساتھ ان کے تعلق پر بحث کر سکیں۔

3.3 فلسفہ کے مشرقی نظام (Eastern System of Philosophy)

3.3.1 سانکھیہ (Sankhya)

تعارف:

سانکھیہ فلسفہ بھارت کے چھ فلسفوں میں سے ایک اہم فلسفہ مانا جاتا ہے۔ اس فلسفے کے بانی مشہور عالم کپل (Kapila) ہے۔ اس فلسفے میں خاص طور پر تخلیق کے سوال پر غور کیا گیا ہے۔ سانکھیہ فلسفے میں سانکھیہ اور یوگا دونوں نظریات کا حسین سنگم نظر آتا ہے واضح رہے کہ سانکھیہ، نظریات کو پیش کرتا ہے اور یوگا اُن کے عملی پہلو اجاگر کرتا ہے۔

سانکھیہ دراصل ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی ''تعداد'' (نمبر) کے ہوتے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم میں سانکھیہ فلسفہ سے مراد وہ فلسفہ ہے جو اس کائنات کی حقیقت اولیٰ سمجھنے کے لیے اس کے اجزا کی ماہیت (Nature) اور تعداد کو متعیّن کرتا ہے تاکہ حقیقت کی پردہ کشائی کی جا سکے۔ سانکھیہ کا ایک اور مفہوم ''مکمل علم'' بھی ہوتا ہے۔

سانکھیہ فلسفہ حقیقت کی تلاش کو دو زاویوں سے دیکھتا ہے۔ اِن کے نزدیک دو حتمی حقیقتیں (Ultimate realities) ہیں۔

1۔ پراکرتی یعنی مادّہ

2۔ پروشا، نفس (روح)

اس فلسفے کے نزدیک مادّہ اور روح دونوں بھی مساوی طور پر حقیقی ہیں۔ ان کے مطابق پروشا (نفس) ایک نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ

ہیں۔

سانکھیہ فلسفہ:

☆ ہندوستان کے فلسفوں کی چھ شاخیں ہیں اس میں سے سانکھیہ کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

☆ اس فلسفے کے حامی تخلیق کے مسئلے پر زیادہ غور کرتے ہیں۔

☆ ان کے مطابق کوئی چیز عدم سے وجود میں آتی ہے اور جو چیز موجود ہے وہ غائب نہیں ہو سکتی ہے۔

☆ شے کے وجود میں آنے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ موجود ہوتی ہے۔

☆ گویا تخلیق کا مطلب چھپی ہوئی چیز کا اظہار ہے۔اسی طرح تخریب (توڑ پھوڑ) اس کے ظاہر کو چھپا دیتی ہے۔تو اس طرح تعمیر اور تخریب دونوں میں کسی ایک ہیت (Form) یا خصوصیت کو ہم ترک کر دیتے ہیں اور کسی دوسری ہیت یا خصوصیت کو اختیار کر لیتے ہیں۔

☆ وجہ اور اس کے اثر میں، علت اور معلول میں صرف ہیت (Form) کا فرق ہوتا ہے۔

☆ اثر اپنی وجہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے اس کو ستک درواد کہتے ہیں۔ یہ لوگ وجہ اور اثر کے آزادانہ وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وجہ اور اثر میں یقین رکھنے والے افراد بھی نظریاتی لحاظ سے مزید دو قسموں میں تقسیم ہوئے ہیں

i) پرینام وادا　　　ii) وی وارتا وادا

پرینام وادا	وی وارتا وادا
1) پرینام وادا کے مطابق وجہ حقیقت میں اثر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔	1) وی وارتا وادا کے مطابق وجہ ایک وہم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
2) پرینام وادا کی مثال مٹی کا صراحی میں تبدیل ہونا۔	2) وی وارتا وادا کی مثال کسی رسی کا سانپ نظر آنا ہے۔
3) پرینام وادا کے مطابق وجہ اور اثر یا علت اور معلول ایک ہی ہے۔	3) وی وارتا وادا کے مطابق دونوں الگ الگ ہیں۔
4) پرینام وادا پر سانکھیہ فلاسفر یقین رکھتے ہیں۔	4) وی وارتا وادا پر ویدک فلاسفر یقین رکھتے ہیں۔

راما نجم کے مطابق کائنات برہمن کی وجہ سے وجود میں آئی ہے جب کہ سانکھیہ کے مطابق کائنات پراکرتی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔

سانکھیہ فلسفہ کے اہم تصورات:

اس فلسفے کے اہم تصورات ذیل میں دیے گئے ہیں۔

i) اسادکرانت:

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے وہ تخلیقی صلاحیت سے محروم ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے وہ کسی کی وجہ بھی نہیں بن سکتی ہے۔ گویا اثر وجہ میں بالقوی موجود ہوتا ہے۔ اگر وجہ میں اثر موجود نہ ہو تو وجہ کبھی بھی اثر کو ظاہر نہیں

کر سکتی۔

ii) **اپدرانہ گرہنت**:

کسی بھی تخلیق کے لیے ایک مادی وجہہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ مادی وجہہ موجود نہ ہوتو اثر کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتا گویا اثر مادی وجہہ کا اظہار ہے۔ کیوں کہ وہ اِس کا ناگزیر حصّہ ہے۔

iii) **سروسنبھاوت**:

اگر اثر کسی بھی مادی وجہہ سے تعلق نہ رکھتا ہوتو کوئی بھی وجہہ کسی بھی اثر کو ظاہر کرسکتی ہے۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اثر کے اظہار سے پہلے وجہہ موجود ہوتی ہے۔

iv) **سکتسیہ سا کیہ کرانت**:

اس اصول کے مطابق تخلیق چھپی ہوئی صلاحیت یا ایک وجہہ وہی اثر ظاہر کرے گی جو اس کے اندر بالقوی موجود ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتو ہم ریت سے کھانے کے تیل کو حاصل کر سکتے ہیں۔

v) **کرانہ واہت**:

اس کے مطابق اثر اور وجہہ کی اپنی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ ان کے درمیان کی رکاوٹوں کو دور کردینے پر اثر' وجہہ کے ذریعے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ اثر وجہہ میں اُس کے اظہار سے پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ اس فلسفے میں موثر وجہہ اور مادی وجہہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ مادی وجہہ اثر میں داخل ہوتی ہے جب کہ موثر وجہہ باہر کام کرتی ہے۔

مثلاً: تیل نکالنے کے لیے بیج کا توڑنا۔

ویسا کے مطابق درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے

i مکاں (Space) ii زماں (Time) iii حالت (Shape)

iv ہیت (Form) جب کسی شے کی اندرونی خاصیت تبدیل ہوتو اُسے ہم خصوصی اثر کہتے ہیں۔ اور جب شے ظاہری طور تبدیل ہوتو اُسے ظاہری نتیجہ کہتے ہیں۔

پراکرتی:

اس فلسفے کے مطابق اس کائنات کی پہلی وجہہ پراکرتی ہے۔ جس کے بعد تخلیق کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کائنات کے تمام اثرات کسی پر منحصر ہوتے ہیں۔ پراکرتی یہ کائنات کا سب سے پہلا عنصر ہے اس لیے اُسے ''پردھانہ'' بھی کہتے ہیں۔ لوک چاریہ کہتے ہیں کہ اسے پراکرتی کہنے کی وجوہات ہیں کیوں کہ اس سے تمام تخریب وجود میں آتی ہے۔ اسے ''اودیہ'' بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ علم کے مخالف ہے۔ اس کو' مایہ'' بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس سے مختلف چیزیں تخلیق پاتی ہیں یا ارتقا کرتی ہے۔ اس کائنات وجوہات (علت) اور معلول (اثر) کا نتیجہ ہے اس لیے اس کی بھی کوئی وجہہ ہونی چاہیے۔ بنیادی وجہہ (Fundamental cause) کوئی ذات نہیں ہوسکتی کیوں کہ ذات (self) نہ وجہہ نہ ہی اثر اور ذات کی خصوصیات کائنات میں پائے جانے والی اشیا کے مخالف ہوتی ہیں۔ چارواکہ (فلسفہ)، بدھسیٹ، جین، نیایہ وغیرہ ان فلسفوں کے مطابق یہ کائنات زمین پانی' آگ اور ہوا کے جوہروں سے مل کر بنی ہے۔

اس فلسفے کے مطابق دماغ، ذہانت اور خودی، ان طبعی عناصر سے مل کر نہیں بن سکتے اس طرح اس کائنات کی وجہ گو کہ طبعی ہوگی مگر اس

کائنات کی وجہ اس طرح ہونی چاہیے جس میں اس کی طبعی خصوصیات اور ممکنہ حد تک لامتناہی ہو۔ کائنات کی کوئی ابتدا اور انتہا نہ ہو۔ اور وہ دوسری چیزوں کے وجود میں آنے کا واسطہ (Cause) ہو کیوں کہ یہ تمام خصوصیات پراکرتی میں ملتی ہیں۔ لہٰذا پراکرتی اولین وجہ (علت) ہے۔

پراکرتی اور اشیاء:

اشیا	پراکرتی
1) اشیا پراکرتی سے تخلیق پاتی ہیں، وہ فانی ہوتی ہیں۔	1) پراکرتی ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔
2) اشیا ایک سے زیادہ ہوتی ہیں۔	2) پراکرتی ایک ہی ہوتی ہے۔
3) اشیا پیدا ہوتی ہیں، اور مرتی ہیں۔	3) پراکرتی نہ پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے۔
4) اشیا میں تعمیر اور تخریب (توڑ پھوڑ) ہوتی ہے۔	4) پراکرتی تعمیر اور تخریب (توڑ پھوڑ) سے بے نیاز ہوتی ہے۔
5) اشیا کے حصے ہوتے ہیں	5) پراکرتی کے کوئی حصے نہیں ہوتے۔

پراکرتی بہت زیادہ لطیف ہوتی ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے وہ اپنی تخلیق سے جانی جاتی ہے۔ ایشورا کرشنا کے مطابق پراکرتی کسی سے پیدا نہیں ہوئی۔ وہ لال ہے، سفید ہے اور کالی ہے۔ تمام کی ماں ہے اور سب کو پالنے پوسنے والی ہے۔ اور جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ بظاہر حقیقت میں پراکرتی ایک نام ہے جس کی موجودگی حقیقت ہے۔ اور اس کا وجود اس کائنات میں ملتا ہے۔ ہم پراکرتی کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ کیوں کہ ہمارا علم کائنات کے معروضی وجود تک ہی محدود ہے۔ پراکرتی کا وجود ہی حقیقت اولیٰ ہے۔ اُس کے وجود کا احساس اس کائنات میں تخلیق شدہ اشیا کے ذریعے ہوتا ہے۔

1) **بھیدانم پریمانت:**

چوں کہ کائنات کی تمام اشیا محدود ہیں، ایکدوسرے پر منحصر ہیں، اور ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اور آخرکار ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے وہ وجہ جو انہیں پیدا کرتی ہے اُس علت (وجہہ) کو لامحدود، آزاد اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہونا چاہیے۔

2) **بھیدانم سمنویات:**

کائنات کی اشیا الگ الگ ہونے کے باوجود کچھ خصوصیات یکساں رکھتی ہیں۔ اس لیے ان میں خوشی، غم اور اختلافات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ کوئی ایسی طاقت ہو جو ان تمام وجوہات کی وجہہ ہو اور انہیں ایک مشترک دھاگے میں باندھے رکھے۔

3) **کریاتھ پراُور تیچھا:**

تمام وجوہات ایک اولین وجہہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ جن میں وہ وجہہ باطنی طور پر موجود ہوتی ہے۔ تمام اشیا میں ارتقا ہوتا ہے۔ اور وہ طاقت جو یہ ارتقا عمل میں لاتی ہے اُسے کائنات کی تخلیق کی وجہہ ہونا چاہیے۔ اور یہ وجہہ پراکرتی ہے۔

4) **کرِنہ کرِیہ وبھاگاتا:**

وجہہ اور اثر دونوں الگ الگ ہوتے ہیں۔ وجہہ اثر کو ظاہر کرتی ہے اور اثر وجہہ میں چھپا ہوتا ہے۔ ہر وجہہ کا کوئی نہ کوئی اثر ہوتا ہے اس لیے اس کائنات کی بھی کوئی نہ کوئی وجہہ ہونی چاہیے۔ گویا ایسی وجہہ جس میں کائنات چھپی ہوئی ہو اور یہی پراکرتی ہے۔

5) اوی بھاگت ویش وارو پاسیہ:

اس فلسفے میں علت اور معلول کے درمیان ایک شناخت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب ہم حال سے ماضی کی طرف سفر کرتے ہیں تو اثر کی شناخت وجہ میں گم ہوجاتی ہے اس عمل میں ہر اثر وجہ میں حل ہوجاتا ہے۔ اس طرح گویا کائنات میں یکسانیت برقرار رہتی ہے اور وہ طاقت جو نظر نہیں آتی اُس میں تمام موجودات ضم ہوجاتی ہیں۔

پراکرتی کی خصوصیات:

☆ پراکرتی کے تین گُن (خصوصیات) ہیں، ستاوا، رجس، اور تمس۔

☆ اس فلسفے کے مطابق کائنات میں توازن کی کیفیت ستاوٗا، رجسؔ اور تمسؔ کو ہم پراکرتی کہتے ہیں۔

☆ تجزیہ کرنے پر پراکرتی کو ہم تین ٹھوس اشیا (Substance) سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

☆ یہ تینوں اشیا بنیادی عناصر ہیں۔

☆ انہیں ہم پراکرتی کی مساوی اشیا کہہ سکتے ہیں۔

☆ ان کی مثال ہار میں دھاگے کی سی ہے۔

☆ ستاوا کے معنیٰ اچھائی، رحم دلی، روشن کرنے والا، اور تعمیری کام کے ہوتے ہیں۔ یہ خوشی اور مسرت سے متعلق ہے۔ یہ ایک مثبت عنصر ہے۔

☆ رجس کے معنی انتشار، بدنظمی، جوش وجذبہ، قوتِ محرکہ اور خیر وشر کی بالقوی قوت ہے۔ یہ عمل سے متعلق ہے

☆ تمس کے معنی اندھیرا، جہالت، تخریب، کاہلی، اور منفی کاموں کے آتے ہیں۔ یہ بےعملی سے متعلق ہے۔

نفس کی حقیقت Nature of Self

پروشا:

سانکھیہ فلسفہ میں یہ ایک مخصوص اصطلاح (Term) ہے اس سے مراد ذات جاننے والا اور فاعل (کام کرنے والا) ہے۔ یہ نہ جسم ہے اور نہ ہی روح، ذہن اور نہ ہی خودی یہ شعور کی کیفیت کا بھی نام نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں خالص شعور کا نام ہے یہ تمام علم کی بنیاد ہے۔ یہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ علم کی شے نہیں ہوسکتا۔ وہ مشاہدہ کرنے والا غیر جانب دار اور ہمیشہ سے آزاد (free Eternally) اور پُرامن ہے۔ وہ زماں اور مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ وہ خود ہی علم اور شعور کا منبع ہے۔ وہ اپنی ذات میں آپ خود اپنا ثبوت ہے۔ اُس کی کوئی متعین شکل نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے۔ اُس کا انکار ناممکن ہے۔ وہ تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ وہ پراکرتی کی حدود سے دور ہے۔

سانکھیہ فلسفہ اور نجات کا تصور:

اس فلسفے کے مطابق انسانی زندگی دکھوں اور غموں سے بھری پڑی ہے۔

ان کے مطابق مشکلات کی تین بڑی قسمیں ہیں۔

(i) ادھیات مک:

اس میں جسمانی، ذہنی وجوہات ہوتی ہیں مثلاً جسمانی اور ذہنی بیماری، غصہ اور بھوک کا شمار ہوتا ہے۔

(ii) ادھی بھاوٗتکہ

یہ مسائل قدرتی آفات انسانی آفات (جنگ فساد مار پیٹ) اور جانوروں کے ذریعے سے مشکلات جیسے۔ سانپ کا کاٹنا یا ہاتھی کا ٹیخ دینا شمار ہوتا ہے۔

(iii) ادھی رائے وک

یہ آفات یا مشکلات ستارے شیطان، جن، بھوت، چڑیل (witch) وغیرہ کے ذریعے سے پیش آتی ہیں۔

راہ نجات:

جہالت تمام مسائل کی جڑ ہے (Ignorance is the cause of suffering) اور جہالت کا مطلب اپنی اصل اور حقیقی حیثیت کو نہ جاننا یہ سب سے بڑی جہالت ہے۔ ان کے نزدیک پراکرتی اور پروشا (نفس) کے درمیان فرق کرنا نجات کے لیے ضروری ہے۔ جیون مکتی اور دہیھہ مکتی جب جیوا (زندگی) پر حقیقت واضح ہو جاتی ہے اُس وقت وہ آزادی حاصل کر لیتا ہے اگر چہ وہ جسم میں رہتا ہے کیوں کہ یہ اس کے سابقہ یا پچھلے اعمال کی وجہ ہے۔ ایسا جیو کسی دکھ اور درد کو محسوس نہیں کرتا ایسا جیو تمام مشکلات سے آزاد ہوتا ہے آگے چل کر اُسے جسمانی نجات بھی مل جاتی ہے۔

سانکھیہ فلسفہ کا نظریہ علم:

ان کے نزدیک علم کے تین اہم ذرائع ہیں۔

1) ادراک، (Perception) یعنی شعور، عقل، احساس

2) استنباط، (Inference) یعنی استدلال، استخراج

3) شہادت (Testimony) یعنی، گواہی، اعتراف، وحی، تصدیق وغیرہ

سانکھیہ فلسفے کے مطابق علم مہیا کرنے میں مانس (ذہن) مہت (عقل) اور پروشا کا اہم کردار ہوتا ہے۔ جب ہمارے حواس کسی شے کے رابطے میں آتے ہیں تو اُس کے بارے میں ایک احساس یا تاثر ہمارے دماغ تک جاتا ہے۔ دماغ اُن تاثرات/ احساسات پر عمل کر کے اُنھیں مناسب شکل دے کر ایک فیصلہ کُن شے کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ ادراک مہت یعنی عقل تک جاتا ہے۔ عقل وہاں پر اُسے تبدیل کر کے اُسے ایک مخصوص شکل دیتی ہے۔ اس پر بھی علم کا عمل مکمل نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ عقل ایک مادی شے ہے جو شعور سے عاری ہے۔ گو کہ وہ پروشا کے شعور کو منعکس کرتی ہے۔ مثلاً آئینہ اپنے آپ سے عکس پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسے عکس کے اظہار کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں شے کے عکس کو ظاہر کر سکے اس طرح علم کے اظہار کے لیے مہت کو پروشا کے شعور کی روشنی درکار ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

---

1) سانکھیہ فلسفے کا بانی..................ہے۔

2) سانکھیہ کے نزدیک دو حتمی حقیقتیں...................... ....ہیں۔

3) وجہ اور اثر میں.................. کا فرق ہوتا ہے۔

4) کسی بھی تخلیق کے لیے ایک.......................... وجہ کا ہونا ضروری ہے۔

5) اشیا...........................ہوتی ہیں۔

3.3.2 یوگا:(Yoga)

یوگا فلسفہ انسان کو آزادی حاصل کرنے اور نجات پانے کا عملی طریقہ یا ذریعہ بتاتا ہے۔ ہندوستان میں کئی طرح کے یوگا پر عمل ہوتا ہے لیکن ان میں پاتانجلی طریقہ زیادہ مشہور ہے۔ یوگا سانکھیہ فلسفے کے نظریاتی پہلوؤں کی عملی شکل ہے۔ دونوں فلسفے یہ مانتے ہیں کہ آزادی اور نجات کے لیے علم بہت ضروری یا ناگزیر ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو اُس کی جسمانی اور ذہنی خواہشات کو دبانا ہوگا۔ اپنے جسم، حواس، ذہن، عقل، اور انا (خودی) پر قابو حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے ذریعے ہم اپنی حقیقت کو پہچان سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری حقیقی ذات ان سب سے بے نیاز ہے۔

سانکھیہ فلسفے میں علم کے جو ذرائع یعنی مطالعہ، ارتکاز (concentration) اور گیان دھیان (مراقبہ) کو یوگا فلسفہ بھی علم کے ذرائع مانتا ہے۔ اس کے ساتھ یوگا فلسفے میں تصورات (Perception)، مشاہدے سے نتائج اخذ کرنا (Inference) اور مذہبی کتابیں (Scripture) بھی علم کے ذرائع ہیں۔

یوگا فلسفہ میں سانکھیہ فلسفہ کے 25 نکات کے علاوہ ایک اور نکتہ ''خلا'' کو شامل کیا گیا ہے اس طرح سانکھیہ فلسفہ اور یوگا فلسفہ دونوں مابعدالطبعیات (Metaphysics) میں یکساں ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یوگا سانکھیہ فلسفے کی عملی شکل ہے۔

یوگا کے نفسیاتی پہلو:

یوگا میں ستہ کی بڑی اہمیت ہے یہ پراکرتی میں ایک تبدیلی کا نام ہے اس تبدیلی میں رجس اور تمس پر ستاوا کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ یہ ایک مادی کیفیت ہے جو ذات (Self) کی قربت کی وجہ سے روشن ہوجاتا ہے اور یہ جس شے کے تعلق میں آتا ہے اُس کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کیفیت کے ذریعے ذات (Self) ان اشیاء کا علم حاصل کرتی ہے ہماری ذات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جو تبدیلی نظر آتی ہے وہ ایسی ہوتی ہے گویا ندی کے پانی میں ہمیں چاند حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب ہماری ذات کو حقیقی علم حاصل ہوتا ہے اُس وقت ہم ستہ سے بے نیاز ہوجاتے ہیں اس طرح ہم دنیاوی یا مادّی خوشی اور غم کی غلامی یا اثرات سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ یوگا کے ذریعے ہم ستہ میں ہونے والی تبدیلیوں پر قابو پاسکتے ہیں۔

ستہ کے مراحل:

ستہ کے پانچ مراحل (stages) ہیں:

1) کسپتا (Ksipta):

اس مرحلے میں ستہ بنیادی حرص اور ہوس اور لالچ کی بہت زیادہ غلام ہوجاتی ہے۔

2) مودھا (Mudha):

جب تمّس غالب ہوجاتی ہے یا چھاجاتی ہے اُس وقت ستّہ کی کیفیت کو مودھا کہتے ہیں۔

3) وی کسپتا (Viksipta):

اس کیفیت میں ستاوا کے چھاجانے کے باوجود ستّہ کامیابی اور ناکامی کے درمیان رجس کی وجہ سے چکر کاٹتی رہتی ہے۔

4) اکاگرا(Ekagra):

جب ستا وا کیفیت کی وجہ سے کسپتا کسی ایک کام پر جم جاتی ہے یا مرکوز ہوجاتی ہے۔مثلاً آگ کا شعلہ ہمیشہ ایک نقطے پر مرکوز ہوتا ہے۔

5) نرودھا(Nirudha):

جب ستّہ میں تبدیلی کے بعد اُس کا عکس باقی رہ جاتا ہے تو وہ حالت نرودھا کہلاتی ہے اس حالت کو ہم یوگا کہتے ہیں۔

ستہ میں تبدیلیاں:

ستہ ایک مادی وجود کا نام ہے کیوں کہ اس سے ذات (self) کا اظہار ہوتا ہے۔ستہ میں یہ تبدیلیاں جہالت کی وجہ سے آتی ہیں جس کا نتیجہ غلامی ہوتا ہے۔ستہّ میں تبدیلوں کی پانچ قسمیں ہیں۔

1) پرمانا:

تصورات ،خیالات ،مشاہدہ ،نتیجہ اخذ کرنا اور مذہبی کتابیں علم کے ذرائع ہیں۔حواس کے ذریعے ستّہ ایک فعل یا کام کی شکل اختیار کرلیتا ہے مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ حواس کے ذریعے تصدیق شدہ مشاہدات ہی علم کا ذریعہ ہیں۔

2) وی پر یایا:

کسی بھی شے کے بارے میں غلط علم وی پر یایا کہلاتا ہے۔شک (Doubt) اسی میں شامل ہے۔

3) وکلپا:

یہ وہ علم ہوتا ہے جس میں جس شے کے بارے میں علم ہوتا ہے موجود نہیں ہوتی ہے۔مثلاً شعور اور ذات کا ایک ہونا، جب کہ ہم شعور اور ذات میں امتیاز کرتے ہیں۔جب ہم کوئی دو اشیاء کے بارے میں واضح طور پر فرق کریں تو وہ وکلپا کہلاتی ہے۔

4) ندرا:

یہ نیند سے مشابہ کیفیت کا نام ہے جس میں حقیقی علم موجود نہیں ہوتا ہے مگر یہ مکمل جہالت بھی نہیں ہوتی ہے۔

5) سمرتی:

سمرتی حافظے کو کہتے ہیں۔اس کا مطلب پرانے تجربات کو یاد کرنا ہے۔

اس طرح ستّہ میں مندرجہ بالا تبدیلیوں کی ایک سائیکل چلتی ہے۔یوگا کے مطابق ستّہ میں تبدیلیوں کی کئی وجوہات ہیں۔مثلاً بیماری، سستی اور کاہلی، شک وغیرہ ان تمام کے لیے یوگا توجہ مرکوز کرنے کے لیے مشق کراتا ہے۔اس کے ساتھ جانداروں سے محبت ،مصیبت میں لوگوں کو ہمدردی کی تعلیم دینا۔بُرے لوگوں سے نفرت اور نیک لوگوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔

یوگا کے سدھ (اصول):

1) انیما: یہ وہ طاقت ہوتی ہے جس کے ذریعے Atom کی طرح باریک ترین اور نظر نہ آنے والے بن سکتے ہیں۔

2) لگھیما: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے روئی کی طرح ہلکے بن کر ہوا میں اڑا جاسکتا ہے۔

3) مھیما: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے پہاڑوں کی طرح بڑا بنا جاسکتا ہے۔

4) پراپتی: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے خواہش کی گئی تمام چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

5) راکمیا: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے سے ہم عزائم کی کمزوریوں کو دور کر سکتے ہیں۔

6) واستوا: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے تمام جانداروں پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

7) ایت ذا: تمام طبعی اشیا پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

8) یاترا کام واستوا: یہ وہ طاقت ہے جس کے ذریعے سے تمام خواہشات پوری کی جا سکتی ہیں۔

یوگا میں ان طاقتوں کے حصول کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے کیوں کہ یوگا کا اصل مقصد طاقت کا حصول نہیں بلکہ نجات کی حقیقت کو پانا ہے۔

یوگا کے آٹھ اقسام:

ستہ پر قابو پانے اور دھیان مرکوز کرنے کے لیے یوگا ذیل کے آٹھ سادھن تجویز کرتا ہے۔

۱) سیما: جسم زبان اور ذہن پر قابو پانے کا نام سیما ہے۔ سیما کی پانچ قسمیں ہیں۔

i) اہنسا: ہر قسم کے تشدد سے پرہیز۔ کسی بھی جاندار کو تکلیف نہ پہنچانا۔

ii) ستیہ: قول اور فعل میں یکسانیت، حق کا اظہار

iii) استیہ: چوری نہ کرنا اور دوسروں کے مال پر بھی بری نظر نہ ڈالنا

iv) بھرم چاریہ: یہ حیوانی جذبات پر قابو پانا ہے۔

v) اپری گرہ: حرص وحوس سے پرہیز

2) نیما: اس کا مطلب اچھے اخلاق اور کردار کی پیروی کرنا ہے۔ اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

i) سوّچھ: اندرونی اور بیرونی صفائی کا اہتمام مثلاً غسل کرنا اور مناسب غذا کا استعمال کرنا، ایثار و قربانی خوشی اور دنیا سے بے رغبتی ہے۔

ii) سنتوش: کم چیزوں پر راضی ہونا۔

iii) تپا: تپا یعنی وہ سرگرمی جس میں سردی اور گرمی میں رہنے کی کوشش کی جائے تا کہ موسمی اثرات سے متاثر نہ ہوں

iv) سوادھیائے (مطالعہ): مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔

v) ایشو پروانی دھان: خدا کی یاد اور اس کی فرمابرداری اور احکام ماننا۔

3) آسن: آسن کے ذریعے ہم توجہ مرکوز کرنے اور جسم پر قابو پانے کی مشق کرتے ہیں ستہ پر قابو پانے اور ذہن پر کنٹرول کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

- پدما آسن
- بھدرا آسن
- گروڑ آسن
- آسٹرسا آسن
- میورا آسن

ان آسنوں کے ذریعے جسمانی اعضا اور دماغ پر قابو پانے میں بہت مدد ملتی ہے ان کے ذریعے ہم سردی اور گرمی سے ہونے والی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آسن کے ذریعے ہمارا جسم مضبوط ہوتا ہے۔ ذہنی صحت کے لیے جسم پر قابو بھی ضروری ہے۔

یہ فلسفہ معلّم اور طالبِ علم دونوں سے جسمانی، ذہنی اور عقلی نظم وضبط کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جسمانی اور ذہنی نظم وضبط تعلیم کے عمل کی جان ہے۔

یوگا اور تعلیم:

یوگا میں بطور خاص طالب علم کو مادی مشکلات کا حل بتایا جاتا ہے۔ اُس کی ذہنی صحت کو بہتر بنانے، تناؤ کا مقابلہ کرنے، جذبات پر قابو پانے اور بیش فعالیت (Hyperactivity) پر قابو پانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ طلبا میں صبر اور تحمّل پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی قوت ارادی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اُنھیں اپنے باطن کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ اُن کے اندر کے تخلیقی شعور کو بیدار کر کے اُن کو اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

یوگا فلسفے میں معلّم کی بڑی اہمیت ہے۔ معلّم صرف نظریاتی تعلیم ہی نہ دے بلکہ عملی کام کر کے مظاہرہ بھی کرے۔ معلّم کو علم کی طاقت، قوت ارادی اور عمل کی قوت سے آراستہ ہونا چاہیے۔ یوگا فلسفہ چاہتا ہے کہ طلبا اپنے آپ کو مکمّل طور پر اپنے معلّم کے حوالے کر دیں۔ کیوں کہ معلّم کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یوگا کے طریقۂ تعلیم میں ارتکاز (Concentration) کی بڑی اہمیت ہے۔ یوگا سائنسی اور عملی طریقے اپناتا ہے۔ اس فلسفے میں تعلیم اور نظم وضبط ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1) بھارت میں یوگا کا............................... طریقہ مشہور ہے۔

2) یوگا فلسفہ، سانکھیہ فلسفے کی............................... شکل ہے۔

3) یوگا میں............................... آسن ہوتے ہیں۔

جوابات:

1۔ پاتانجلی 2۔ عملی 3۔ آٹھ

3.3.3 نیایہ (Nyaya)

نیایہ سنسکرت لفظ ہے اس کے معنی ''مضمون کی تفصیلات'' میں جانے کے ہوتے ہیں۔ اس میں مضمون کا تجزیاتی مطالعہ منطقی انداز میں کیا جاتا ہے۔ نیایہ کو ترک ودیاّ یعنی وجوہات کا علم اور وداودیہّ یعنی مباحثہ کا علم بھی کہتے ہیں۔ اس فلسفے نے منطق کے ذریعے علم پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک علم کا مطلب اشیا کا اظہار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علم کے ذریعے اشیا چراغ کی مانند روشن ہو جاتی ہیں۔

انسانی زندگی میں دکھوں سے نجات

ہم جانتے ہیں کہ بھارتی فلسفوں میں انسانی دکھوں کا مسلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیایہ فلسفے کا مقصد اس دکھ سے نجات حاصل کرنا

ہے۔اس فلسفے کے مطابق یہ دنیا ہمارے سامنے اعمال اور نتائج کے چکّر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔اور ہمیں دکھوں سے نجات پانے کے لیے چکّر کو توڑنا ہوتا ہے۔

اس چکّر کی ابتدا غلط فہمی (Misapprehension) سے ہوتی ہے۔اس کا مطلب اشیا کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہنا ہے۔یا حقیقت پر توہمات اور غلط خیالات کا پردہ ڈالنا ہے۔اور یہ کہ آدمی اپنے آپ کو صرف ذہن اور جسم کا مرکب سمجھے۔دوسرے مرحلے میں عدم توازن (Imbalance) ہوتا ہے۔اس میں فرد، انا (ego) کا شکار ہو جاتا ہے۔اور اس کے لیے وہ جھوٹے سہارے لیتا ہے۔

تیسرا مرحلہ کرما یعنی عمل کا ہوتا ہے۔عمل کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔مثبت، منفی اور غیر جانب دار۔مثبت اور منفی اعمال کا نتیجہ فوری یا دیر سے ضرور ملتا ہے۔چوتھے دور میں پنر جنم یعنی دوبارہ زندگی ملتی ہے۔جو ہمارے سابقہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔آخری مرحلہ دکھوں کا ہوتا ہے۔اس میں انسان بیماریوں، بے اطمینانی، غم، دباؤ اور یاسیت کا شکار ہوتا ہے۔اس چکّر کو توڑنے کے لیے ہمیں بصیرت اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔زندگی سے عدم توازن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔عمل اور اُس کے نتیجے میں پنر جنم کے چکّر کو ختم کرنا یعنی نجات حاصل کرنا ہے۔نجات کے حاصل کرنے کے لیے یہ فلسفہ ہمیں درج ذیل چار نکات پر مبنی تعلیم دیتا ہے۔

1) پرہیز۔دُکھوں سے　　2) دُکھ کی وجہ۔خواہشات، جہالت وغیرہ

3) دُکھ سے نجات۔قطعی پرہیز　　4) قطعی پرہیز کے ذرائع۔اشیا کا حقیقی علم

علم کی خصوصیات:

علم کی دو خصوصیات ہیں۔

(1) پرما (حقیقی علم)　　(2) اپرما (غیر حقیقی علم)

(1) پرما: (حقیقی علم)

حقیقی علم وہ ہوتا ہے جس میں ہم شے کی حقیقت جانتے ہیں۔مثلاً (i) سانپ کو سانپ جاننا۔(ii) کٹورہ کو کٹورہ سمجھنا۔حقیقی علم کے چار ذرائع ہیں۔

- ادراک　　- نتیجہ اخذ کرنا (استنباط کرنا)
- تقابل کرنا　　- شہادت حاصل کرنا

(2) اپرما: (غیر حقیقی علم)

ان چار ذرائع کے علاوہ حاصل ہونے والا علم غیر حقیقی علم کہلاتا ہے۔

(1) ادراک Perception

- اس کو قوت مشاہدہ بھی کہتے ہیں۔
- اس کے ذریعے ہم ذاتی سمجھ کے مطابق ایک احساس بناتے ہیں۔
- اس میں شے ہمارے بیرون میں واقع ہوتی ہے۔
- ہم کسی شے سے حواس خمسہ سے قربت کے نتیجے میں اُس کا علم حاصل کرتے ہیں۔اس طرح ہم اس شے کا حقیقی علم حاصل کرتے ہیں۔

مثلاً۔ کسی شے کا میری آنکھ کے سامنے موجود ہونا اُس شے کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں ہوتا ہے۔

کلاس روم میں تختہ سیاہ کی موجودگی وغیرہ۔

- اگر میں دور کسی چیز کو انسان کی طرح دیکھوں تو اس میں مجھے شک ہو سکتا ہے اور اس شے کے بارے میں میرا علم غیر حقیقی ہوگا۔ لیکن اگر وہ شے میری آنکھوں کے قریب ہو تو میں اُس کی حقیقت کو جان سکتا ہوں۔ اس طرح ہم کسی رسی کو سانپ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ حقیقی علم نہیں ہوگا۔

- اس فلسفے کے ماننے والوں نے چھ طرح کی قربتوں کا اظہار کیا ہے۔

- تصور میں غیر معمولی اور روجدانی علم کو شامل نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ ان کا حواس خمسہ سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

اس طرح ادراک (Perception) میں یا تصور میں اُس شے کو قریب سے دیکھنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اُس شے کے بارے میں فوری احساس کا پیدا ہونا ہے۔ گویا اس طرح سے حاصل ہونے والا علم کسی پچھلے تجربہ کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

ادراک کی خصوصیات:

اس کی دو خصوصیات ہوتی ہیں۔

(i) عمومی (Ordinary) (ii) غیر معمولی (extraordinary)

(i) عمومی تصور:

عمومی تصور کی بھی مزید دو قسمیں ہیں۔ (i اندرونی (ii بیرونی

(1) اندرونی تصور میں شے اور دماغ کا تعلق راست (Direct) ہوتا ہے اور ذہن خوشی، غم، محبت اور نفرت جیسی خصوصیات کو جنم دیتا ہے۔

(2) بیرونی یہ ہمارے حواس خمسہ سے متعلق ہوتا ہے۔

i) دیکھنا ii) سننا iii) چکھنا iv) محسوس کرنا v) چھونا

(ii) غیر معمولی تصور:

غیر معمولی تصور میں ہم حواس خمسہ کے بغیر علم حاصل کر لیتے ہیں۔

عمومی تصور کی خصوصیات:

عمومی احساس، یا تصور کی تین شکلیں ہیں۔

1) جب شے حواس خمسہ کے ربط میں آتی ہے اور ہم اس کے بارے میں کچھ علم حاصل کرتے ہیں مثلاً اُس کا نام اور اس کی خصوصیات وغیرہ یہ تصور کی ابتدائی شکل ہے۔

2) اس کیفیت میں ہم یقینی طور پر اُس شے کی ہیت (Nature) معلوم کرتے ہیں، اس طرح ہم اس شے کے بارے میں حقیقی علم حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ تصور کی ترقی یافتہ شکل ہے اور ہمارے بہت سارے دنیاوی کام اسی وجہہ سے انجام پاتے ہیں۔

3) سابقہ معلومات کی بنیاد پر شے کو شناخت کرنا مثلاً گزشتہ سال ملاقات کرنے والے کسی شخص کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اُس کے نام اور خصوصیات کی شناخت کرنا۔

غیر معمولی تصور کے مراحل:

اس میں اشیا کے درمیان مشترک خصوصیات کی بنیاد پر ان کے الگ الگ گروپ تیار کیے جاتے ہیں۔مثلاً یہ کہنا کہ انسان فانی ہے۔برف ٹھنڈا ہوتا ہے پتھر سخت ہوتا ہے گھاس نرم ہوتی ہے ان میں ٹھنڈک سختی اور نرمی ایسی خصوصیات ہیں جو چھونے کے احساس کے ذریعے معلوم کی جاسکتی ہیں ساتھ ہی ان کو دیکھا بھی جا سکتا ہے۔اس میں ہم وجدان کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں۔یہ عام طور پر یوگی لوگ جو مافوق الفطرت صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ اس طرح کے علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔

استنباط کرنا(نتیجہ اخذ کرنا):(Inference)

اس کا مطلب ہے کسی شے کے بارے میں اندازہ لگانا۔اس کے لیے ہمیں پہلے سے کچھ علم کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بنیاد پر کسی شے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔مثلاً پہاڑی پر آگ لگی ہے کیوں کہ وہاں سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور جہاں دھواں ہوتا ہے وہاں آگ ہوتی ہے۔

نتیجہ اخذ کرنے کے مراحل:

نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ہمیں کم از کم تین مراحل کی ضرورت ہوتی ہے اوپر کی مثال میں ہم نے آگ کے وجود کا پتہ لگایا تھا جہاں پر دھواں ہمارے نتیجے تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔دھویں سے آگ کا نتیجہ کا اخذ کرنے میں پہلا مرحلہ پہاڑی پر دھویں کی موجودگی۔دوسرے مرحلے میں دھویں اور آگ کا قریبی تعلق جس کے بارے میں ہم پہلے سے جانتے ہیں۔تیسرے مرحلے میں پہاڑی یعنی وہ مقام جہاں آگ لگی ہوتی ہے۔

تقابل کرنا:(Comparison)

ہم دو اشیا کے درمیان تقابل کر کے ان کی حقیقت کا علم حاصل کر سکتے ہیں بعض چیزیں اپنی ضد کی وجہ سے بھی سمجھ میں آتی ہیں مثلاً صبح شام، آگ پانی۔

شہادت حاصل کرنا(Testimony):

ہم کسی قابل اعتماد شخص کی شہادت یا گواہی کے ذریعے بھی علم حاصل کرتے ہیں۔وہ شخص ہر قسم کے تعصب اور جانبداری سے پاک ہو۔اپنی تعلیمات کے نتائج سے اُس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو۔اور دیگر ذمہ داران اور ماہرین بھی اُس علم کی تائید کریں۔نیایہ فلسفے میں علم کے ذرائع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اس کے مقابلے میں علم کی نوعیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔

نیایہ فلسفے میں حقیقی علم کے ضمن میں 12 نکات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔وہ اس طرح سے ہیں۔

جسم (body)، نفس (self)، حس (senses)، تجربہ (Experience)، عقل (Intelligence)، ذہن (Intellect)، سرگرمی (activity)، عدم توازن (Imbalance)، نتائج (consequenc)، دُکھ (suffering)، پنر جنم (rebirth) اور نجات (Liberation)

نیایہ فلسفہ اور تعلیم:

اس فلسفے کی سب سے اہم دین اُس کا طریقۂ کار ہے۔اس کا اپنا ایک منطقی (Logical) طریقۂ کار ہے۔اس فلسفے میں علم حقیقی، نجات کا ذریعہ ہے اس لیے اس کے ماننے والوں نے علم کے حقیقی اور سچّے ذرائع کی شناخت میں کافی محنت کی۔ساتھ ہی اُنھوں نے غلط تصورات سے حقیقی علم کو ممتاز کرنے کے لیے بھی کافی کوششیں کیں۔اس فلسفے نے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو منطق اور اتصال و یک رنگی کے

اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی۔اُن کے نزدیک استدلالی طرز سے مراد وہ ذہنی کوششیں ہیں جس میں نتائج کے حصول کے لیے ایک ذہنی عمل سے گذرا جاتا ہے۔جس کی پیروی کی جاسکتی ہو جسے تصدیق کی جاسکتی ہو۔اور جو دیگر عقل مندوں کے لیے بھی قابل قبول ہو۔اس طرح سے حاصل ہونے والا سچائی کا علم آفاقی ہوگا۔

نیا یہ فلسفہ تنقیدی طرزِ فکر کو بڑھاوا دیتا ہے۔اور ہر طرح کے تعصّبات اور غیر عقلی عقائد کو ردّ کرتا ہے۔یہ فلسفہ طلبا میں تعمیری سوچ پروان چڑھاتا ہے۔اس فلسفے نے طلبا کو منطقی انداز میں خودشناسی کی ترغیب دی۔منطق کے علاوہ اس عمل میں وہ مطالعہ،غور وفکر،سماعت اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو اہمیت دیتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

---

1) اندرونی تصوّر میں شے کا تعلق راست ....سے ہوتا ہے۔

2) نیا یہ فلسفے میں علم کی دو قسمیں ....اور..............................ہیں۔

جوابات:

1۔دماغ　　　2۔پرما اور اپرما

3.3.4 تصوف (Sufism)

یہ اکائی نصاب کی دوسری اکائی کا حصہ ہے اس اکائی میں ہم تصوف کی تعریف معنی،تصور،طریقۂ تدریس،نظم وضبط اور معلم کے رول کا مطالعہ کریں گے۔

تصوف کے تین درجات ہیں۔ایمان،اسلام اور احسان۔

ایمان اور اسلام عقیدہ وعمل کا نام ہے اور اس سے ماورا بھی ایک مقام ہے جسے ''اصطلاح حدیث'' میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے بھی سلوک وتصوف اور طریقت کا نام دیتے ہیں (لمعات 46۔44)

تصوف نفس کی اصلاح وتطہیر کا اہتمام کرتا ہے۔تصوف (صوفی) تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن پر اسی لیے زور دیتا ہے کہ اس کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے۔حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں شیخ محمد بن احمد المغریؒ کے حوالے سے تصوف کی اصطلاح کی تعریف یوں بیان فرمائی۔

''تصوف احوال کو حق کے ساتھ قائم رکھنے کا نام ہے''

(کشف المحجوب:40)

تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں بندہ غیر اللہ سے منہ موڑ کر اپنے معبود ومحبوب کے ساتھ بے لوث رشتہ قائم کر لیتا ہے۔نتیجتاً اس تعلقِ بندگی سے اسے وہ روحانی لذت وانبساط اور لطف وکیف نصیب ہوتا ہے۔جسے اقبال کی زبان حقیقت ترجمان نے اس طرح ادا کیا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

المختصر تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں وہ طریق شریعت جس کے ذریعے تزکیہ نفس اور صفائے باطن کے آداب واحوال معلوم ہوں اور معرفت الٰہی کا نور میسر آئے۔ تصوف کہلاتا ہے۔

لفظ صوفی کے اشتقاقی معنی

تصوف کے مادۂ اشتقاق اور لفظ صوفی کی وجہ سے تسمیہ کے باب میں علمائے کبار کے مختلف اقوال ہیں۔ اہل علم نے تصوف کے درج ذیل مادہ ہائے اشتقاق بیان کیے ہیں۔

قول اول ''الصفا''

بعض علماء کے نزدیک تصوف کے مادہ اشتقاق الصفا ہے جس کے معنی صفائی اور پاکیزگی کے ہیں۔ اس مادہ اشتقاق کی رو سے کسی شے کو ہر طرح کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک صاف کر کے اجلا اور شفاف بنا دینا تصوف ہے۔

شیخ ابوالشیخ بستی تصوف کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ تصوف وہ کلمہ ہے جو صفا سے مشتق ہے جس کے معنیٰ صفائی ہے۔ (الشیخ اور سلان الامشتقی 39)

حضرت داتا گنج بخش مخدوم علی ہجویری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں شیخ خضریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ باطن کو مخالفت حق کی کدورت اور سیاہی سے پاک وصاف کر دینے کا نام تصوف ہے۔ (کشفو المحجوب)

قول ثانی ''الصفو''

تصوف کا دوسرا مادہ اشتقاق ''الصفو'' بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے معنیٰ ''محبت اور دوستی میں اخلاص'' کے ہیں۔

جلیس کد صاحب المخدوم اس مادہ کی نسبت رقم طراز ہیں۔

الصفو کے معنی محبت میں اخلاص کے ہیں اور صفی سے مراد مخلص دوست ہوتا ہے۔ (المنجد تحت مادہ صفو) اس مادہ کے اعتبار سے صوفی سے مراد وہ شخص ہے جس نے دنیا و اخرت کے اجر و جزا سے بے نیاز ہو کر محبوب حقیقی سے بے لوث محبت اور دوستی کا رشتہ استوار کر لیا ہو اور جس کی تمام تر مساعی کا محرک فقط رضائے الٰہی کی طلب ہو۔

تیسرا قول ''الصوف''

تصوف کے باب میں تیسرا قول اس کے ''الصوف'' سے مشتق ہونے کا ہے جس کے معنی ''اون'' کے ہیں باب تفعل کے وزن پر تصوف کا معنی ہے۔ اس نے ادنیٰ لباس پہنا۔

اما ابولقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں تصوف (اس وقت کہا جائے) جب کسی نے صوف کا لباس جیسے کسی کے قمیص پہننے پر تقمص بولا جاتا ہے۔

بعض مردان حق نے قرون اولی میں اظہار تذلل (عاجزی کرنا) مجاہدہ اور غایت (غرض مطلب) عجز و نیاز کے خاطر کھودا اونی لباس پہنا چنانچہ اس اونی لباس کی مناسبت سے ان کو صوفی کا لقب ملا۔ شیخ عیاص الدینؒ فرماتے ہیں۔

چوں کہ گزشتہ زمانے (قرون اولیٰ) میں مردان حق (تذلل اور غایت عجز وانکساری کے باعث اونی لباس پہنے لگے تھے۔ اسلیے

(اس مناسبت سے) ان کے اعمال وافعال کو ''تصوف'' کا نام دے دیا گیا۔

علامہ ابن خلدون اسی موقف کی تائید ان الفاظ سے کرتے ہیں ''تصوف'' صوف سے مشتق ہے کیوں کہ اونی لباس اہل تصوف سے مختص تھا۔ کہا گیا ہے کہ اون کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ یہ لباس اسلاف معتقدین کو زیادہ مرغوب تھا کیوں کہ یہ زہد وتواضع کے قریب تر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ انبیاء کا لباس بھی رہا ہے۔

(الشیخ ارسلان الدمشقی)

چوتھا قول ''الصوف''

الصوف سے اشتقاق کے حوالے سے ایک معنیٰ ''یکسو شدن'' بھی بیان کیا گیا ہے۔ بعض کسی طرف سے پوری یکسوئی سے متوجہ ہو جانا۔ اس اعتبار سے تصوف کا مقصود ومطلوب ذات الٰہی کے ذکر ومحبت میں اس قدر یکسوئی اور محویت (خیال میں گھر، غرق ہونا) حاصل کرنا ہے کہ ماسویٰ اللہ کی طلب وخواہش سے دھیان بالکل ہٹ جائے۔

علامہ غیاث الدینؒ فرماتے ہیں'' ہوسکتا ہے کہ تصوف صوف سے مشتق (وہ لفظ جو کسی دوسرے لفظ سے بنایا گیا ہو) ہو جس کے معنی ہے یکسو ہو جانا اور (ہر طرف سے) منہ پھیر لینا ہے چوں کہ اللہ سے وصول واصل ہوتے ہیں اور ماسویٰ اللہ سے رد گردانی کرتے ہیں اس لیے ان احوال کو تصوف کہا جاتا ہے۔

غیاث اللغات 113

پانچواں قول ''الصفہ''

بعض علما نے تصوف کا اشتقا صفہ سے بھی کیا ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ ابو بکر بن اسحاق بخاریؒ فرماتے ہیں ایک گروہ کا کہنا ہے صوفیہ کی وجہ تسمیہ (نام رکھنا) ان کا با اعتبار اوصاف اصحاب صفہ سے قریب تر ہونا ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھے۔ (ایقاظ الھم فی شرح الحکم 4:1)

اسی قول کی تائید میں شیخ احمد الحسینیؒ فرماتے ہیں یہ صفہ سے ماخوذ ہے کیوں کہ تصوف تمام تر خوبیوں سے متصف ہونے اور اوصاف مذمومہ کے ترک کردینے پر مبنی ہے۔ (شرح التصرف المذاہب التصوف 21)

چھٹا قول: ''الصّف''

بعض علما تصوف کو ''الصّف'' سے مشتق قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں امام ابو القاسم القشیریؒ فرماتے ہیں۔ ''تصوف صف سے مشتق ہے گویا کہ صوفیہ کے قلوب باری تعالیٰ کی حضور کے اعتبار سے صف اول میں ہوتے ہیں۔ (الدسالۃ القشیر یں 146)

صوفی ازم کا تصور Concept of Sufism

تصوف اور صوفی کا تصور حضور نبی اکرم ﷺ کے وصال سے کم وبیش سو سال بعد دوسری صدی ہجری میں رواج پذیر ہوا تاہم اس کی شروعات حدیث تفسیر اور فقہ کی اصطلاعات کے باقاعدہ رواج سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔

شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں بھلائی اور اصلاح والے گروہوں کا تذکرہ کیا کسی کو ابرار کہا کسی کو مقربین کہا اور کسی کو صادقین کہا اور کسی کو ذاکرین کہا اور کسی کو محبین کے اسم سے نوازا اسم صوفی، ان تمام گروہوں پر منطبق (برابر یا موافق) ہوتا ہے۔ جو ان اسما کے تحت مذکورہ ہیں اور یہ اسم دور نبوی میں موجود نہ تھا تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اسم دور تابعین میں موجود تھا۔ اور حسن بصریؒ

(تابعی) سے منقول ہے کہ میں ایک صوفی کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور اسے کوئی چیز دی لیکن اس نے نہ لی۔ اور کہا میرے پاس چار روایتیں ہیں حضرت حسن بصری کا دور، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین دور سے واصل یا ملا ہوا دور ہے آپ کی ولادت سیدنا حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہوئی آپ نے خود حضرت علیؓ کے حضور زانوے تلمند تہہ کیا اور تزکیہ نفس، تصفیہ باطن اور معرفت الٰہیہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی وفات 110 ہجری میں ہوئی گویا آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ پہلی صدی ہجری میں بسر ہوا اور آپ نے بڑے بڑے نامور صحابہ کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی صحبتِ فیض رساں سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کو خلفائے راشدین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی اقتداء میں نمازیں پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی آپ نے اپنی زندگی کے کئی سال مدینہ منورہ میں گزارے اور بعد میں آپ بصرہ منتقل ہوگئے۔ گویا حسن بصری براہ راست دورِ صحابہ کے فیض یافتہ ہیں اس لیے آپ کا قول باعتبار روایت واجب تسلیم ہوجاتا ہے۔

درج بالا حسن بصری کا قول اس قول کی تائید کرتا ہے جو سفیان ثوریؒ سے روایت کی گئی ہے کہ اگر شیخ ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء کی باریکیوں کو نہ جان پاتا یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دورِ قدیم میں اسم صوفی معروف تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ اسم ہجرت نبوی کے بعد دو سو سال تک معروف نہ تھا کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں آپ ﷺ کے صحابہ اس آدمی کو صحابی کا نام دیتے جو آپ کی صحبت سے مشرف ہوتا کیوں کہ اس میں صحبت رسول ﷺ کی طرف اشارہ تھا جو ہر اشارے سے بہتر تھا۔ اور عہدِ رسالت مآب ﷺ کے بعد جس نے صحابہ سے علم حاصل کیا اسے تابعی کا نام دیا گیا۔ پھر جب عہدِ رسالت اور آسمانی وحی کے منقطع ہونے کو عرصہ گزر گیا اور نور مصطفویؐ پوشیدہ ہوگیا اور لوگوں کی آرا مختلف ہوگئی۔ اور ہر صاحب رائے اپنی رائے میں منفرد ہوگیا اور علمی فضا کو نفسیاتی خواہشات نے مکدر کر دیا۔ متقین کی بنیادیں ہل گئیں اور زاہدوں کے عزائم متزلزل ہوگئے۔ جہالتوں کا غلبہ ہونے لگا اور تاریکی کے پردے دلوں پر گہرے ہوگئے۔ عادات بگڑ گیئں اور ارباب دنیا خرافات دنیا میں گھر گئے اور خطا کاریوں میں مبتلا ہوگئے تو ایک گروہ نیک اعمال اور روشن احوال اور عزیمت (طلسمی ذعا) میں صدق اور دین میں قوت کے ساتھ الگ ہوگیا انہوں نے دنیا اور اس کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کی اور عزلت وتنہائی کو غنیمت جانا اور انہوں نے اپنے لیے خانقاہ بنائی جہاں وہ کبھی جمع ہوتے اور پھر الگ ہوجاتے ان میں اصحاب صفہ کا نمونہ موجود تھا۔ انہوں نے اسباب کو ترک کر دیا اور ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے تو ان کے نیک اعمال ان کے لیے روشن ومنور احوال کے لیے ثمر آور ہوئے اور علوم الٰہیہ کے قبول کرنے کے لیے فہم کی صفائی مہیا کی اس طرح ان کو ظاہری زبان کے ساتھ ساتھ باطنی زبان اور عرفان حاصل ہوا اور ایمان ظاہری کے ساتھ ساتھ ایقان سے بھی بہرہ ور ہوگئے جس طرح کہ حضرت حارثہ نے فرمایا جب مجھے ایمان کے غیر معمولی مرتبہ کا کشف ہوا جو عام لوگوں میں نہیں پایا جاتا تو میں حقیقی اور صحیح معنوں میں مومن بن گیا بس جب ان علوم نے ان گوشہ نشینوں کو نئے علوم سے واقف کرایا تو انہوں نے ان علوم جدیدہ کے لیے اصطلاحات وضع کیں جو ان کے خیالات کی ترجمانی کرسکیں اور ان کے وجدان وباطنی کیفیات کو ظاہر کرسکیں پھر اخلاف نے اپنے اسلاف سے اس کی تعلیمات حاصل کرنا شروع کیں اور یہ سلسلہ جاری وساری ہوگیا یہاں تک کہ زمانہ مابعد میں اس نے ایک باقاعدہ علم اور مستقل رسم کی صورت اختیار کر لی تو یہ اسم صوفی ان میں رائج ہوگیا اور یہ لوگ خود بھی اسی نام سے موسوم ہوگئے بس اس وقت سے یہ اسم ان کی نشانی ہے اور علم الٰہی ان کی صفت ہے عبادت الٰہی ان کا زیور ہے اور تقویٰ ان کا شعائر اور حقیقت الٰہیہ کے حقائق ان کے اسرار ہیں یہ حضرات قبیلوں کو چھوڑ کر غیرت کے قبول میں رہتے ہیں اور حیرت کی دنیا میں آباد ہوگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے لحظہ بہ لحظہ (پل بہ پل) ترقی کی طرف رواں ہیں اور محبت الٰہی کی آگ ان کے دل میں شعلہ زن ہے اور وہ پھر بھی تشنگی کے عالم میں ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ (عوارف المعارف:204-205)

یہ طویل اقتباس اصطلاح تصوف وصوفی کے آغاز وراج کی بطریق احسن وضاحت کرتا ہے اور اصحاب صوفیا کے ہوس، نفس پرستی قلبی

وذہنی آلودگیوں اوراستخوان گیری کے دور میں عشق الٰہی اور خالص دین کی شمعیں جلانے کی دلیل ناطق ہےاوران اصطلاحات کے مدلولات کے بے مثال بیان ہے اس اقتباس پر جس قدر غور وفکر کیا جائے اہل تصوف بطور فلسفہ روحانیت عبادات وریاضات کا مقصد مدعا ٹھہرتا ہے۔

شیخ ابونصر سراج نے کتاب اللمع میں لکھا ہے کہ بے شک یہ اسم (صوفی) نیا نہیں ہے کیوں کہ حسن بصریؒ نے جنھوں نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا۔ایک صوفی کو کعبہ کے طواف میں مشغول دیکھا۔(الشیخ ارسلان مشقی 25)

لفظ صوفی کا بے ساختگی سے یہ استعمال اس حقیقت کا غماز ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں کسی کو (صوفی) کے نام سے پکار نے کا رواج اس قدر عام تھا کہ لوگ اس اصطلاح سے بخوبی آشنا اور مانوس ہو چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے کمال بے تکلفی سے اس اصطلاح کی تفصیل میں جائے بغیر کہہ دیا کہ میں ایک صوفی کو کعبے کا طواف کرتے ہوئے دیکھا ظاہر ہے کہ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے کہ جس کو یقین ہو کہ جو کچھ وہ کہے گا اس کا سامع بلا تامل سمجھ لے گا۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ صاحب حال بزرگ اور جلیل القدر امام اور صاحب حال بزرگ ہوئے جو امام ابوحنیفہؒ کے استاد بھی اور شاگرد بھی تھے۔آپ اپنے وقت کے بہت بڑے متقی، پرہیز گار محدث،مورخ تھے۔آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ابوعبدالرحمٰن السلمیٰ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔سفیان بن سعید بن مسروق بن حبیب رافع ثوبری آپ عبدالمناۃ کے قبیلہ ثور سے ہیں اور کہا گیا کہ آپ ہمدان کے قبیلہ ثور سے آپ ابوعبداللہ الکوفی ،ان ائمہ میں سے ہیں جو علم کا سمندر تھے اور آپ کوئی بات نہ سنتے تھے مگر یہ کہ آپ کو حفظ ہو جاتی۔خطیب کہتا ہے۔امام ثوری ائمہ مسلمین میں بڑے جلیل القدر امام تھے۔اور دین مبین کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔آپ کی امامت پختگی،ضبط،حفظ اور معرفت پر سب متفق ہیں 141ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا اور 77ھ میں آپ پیدا ہوئے۔(طبقات الصبوفیہ:27)(تذہیب الکمال)

حضرت سفیان ثوری یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے شیخ ابوالہاشم کو نہیں دیکھا تھا مجھے پتہ نہ تھا کہ صوفی کیسے ہوتے ہیں آپ کے وصف کی وجہ سے آپ کو صوفی کہا گیا۔آپ سے پہلے کسی شخص کو اس نام سے نہیں پکارا گیا اسی طرح سب سے پہلے صوفیوں کے لیے آپ (شام) میں پہلی خانقاہ قائم کی گویا سفیان ثوری جیسے بزرگ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اگر شیخ ابوالہاشم صوفی جیسے عارف کامل نہ ہوتے تو ریا کاری کے بارے میں بہت سی باریک اور پیچیدہ باتوں کو ہم نہ جان پاتے اوران کے عرفان سے محروم رہتے۔سوفیان ثوریؒ جلیل القدر تابعی تھے آپ کی وفات 141ھ میں ہوئی۔علمائے دیوبند کا سلسلۂ بیعت وارشاد چشتی ہے اسی بنا پر یہ تمام حضرات حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں۔علما دیوبند کے خواجہؒ سے تعلق کے سلسلے میں سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کا مضمون اہم ہے کہ درحقیقت مدرسہ دیوبند حضرت خواجہ صاحبؒ کے نظر کرم کا طفیل ہے اور دارلعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرسہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا یعقوب دیوبندیؒ نے حضرت خواجہ کی ایما پر دیوبند میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا تھا۔مولانا قاری طیب صاحبؒ نے اپنے مضمون میں آگے لکھا ہے کہ مولانا یعقوبؒ نے کامل کسب فیض کے لیے باضابطہ اجمیر شریف کا سفر کیا اور خواجہ صاحبؒ کی درگاہ کے پاس ایک ٹیلے پر اپنا ٹھکانہ بنالیا اور مسلسل مراقبہ کے ذریعے اپنا حال جاننے کی کوشش کرتے رہے،آخر میں ان کو کشف کے ذریعے یہ ہدایت ملی کے جو بھی کمی ہے وہ دیوبند کے مدرسہ میں حدیث پڑھانے سے مکمل ہو جائے گی۔(بحوالہ المیعتہ خواجہ غریب نواز نمبر)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علما دیوبند تصوف کے حامی اور اس پر عمل کرنے والے تھے۔اتنا ہی نہیں بلکہ بہت بڑے بڑے علماء اجمیر شریف گئے اور وہاں فاتحہ پڑھی۔ان علما میں سے کچھ کے بارے میں وہاں انہوں نے بہت دیر تک فاتحہ پڑھی تھی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن بھی

کئی بار تشریف لے گئے تھے، غالباً 1959ء میں آخری بار حاضر ہوئے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سب نے ہی اجمیر میں حاضری دی ہے۔(روزنامہ راشٹریہ سہارا صفحہ اول اتوار 13/نومبر 2016)
مضمون بالا سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ علما دیوبند کا صوفیوں اور تصوف سے گہرا تعلق رہا ہے۔

تصوف کے بنیادی اصول(Fundamental Principles of Sufism)

اگر شریعت وطریقت میں سے کسی ایک کا فقدان ہوتو یہ دین نامکمل و نا تمام رہتا ہے۔شریعت کا تعلق ان احکام اور انفرادی و اجتماعی امور سے ہے۔جن کی بنا پر فرد اور جماعت کی خارجی زندگی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ عبادات و معاملات دو انواع (قسموں) پر منقسم ہیں۔ جب کہ طریقت کا تعلق ان روحانی لذات اور معنوی کیفیات سے ہے۔ جو اطاعت و نیکی کے نتیجے میں انسان کے دل پر مرتب ہوتی ہیں اسے ہی عام زبان میں تصوف کہا جاتا ہے۔شریعت وطریقت اپنی اپنی ذات میں مستقل ہونے کے باوجود باہم لازم وملزم ہیں۔ان میں جدائی وافتراق (جدائی پیدا کردینا) ناممکن ومحال ہے۔

تصوف کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

1. ایمان
2. اسلام
3. احسان

1) ایمان

ایمان کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ جو شخص اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، جنت اور جہنم پر ایمان لانے اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر بھی یقین رکھے۔ایمان کے معنی ہے کہ انسان کا اللہ اور اس کے رسولوں اور تمام غیب کی چیزوں پر یقین رکھنا یا یقین ہونا۔

2) اسلام

اسلام سے مراد ہے شریعت پر چلنا یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا۔ یہ درجہ ایمان سے ایک درجہ آگے ہے۔یعنی آپ اللہ اور اس کے رسولوں و غائب کی چیزوں پر ایمان لاتے ہوئے شریعت پر عمل کرنا اور اس پر چلنا۔اسے شریعت اور طریقت بھی کہتے ہیں۔

بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی ''شریعت وطریقت کے درمیان کوئی تخائف یعنی باہم مخالف نہیں بلکہ تمام اکابر طریقت نے تصریح کی ہے کہ کمال شریعت ہی کا نام طریقت ہے اتباع رسول ﷺ جب تک محض ظاہری شکلوں تک محدود رہے اس کا نام شریعت ہے، اور جب قلب و باطن بھی نورانیت رسول ﷺ سے منور ہوجائے تو یہی طریقت مثال جس شخص نے نماز کتب، فقہ میں لکھے قواعد کے مطابق پڑھ لی شریعت کی رو سے یہ نماز مکمل ہوگئی مگر طریقت اسے کافی نہ سمجھے گی وہ اس پر مصر ہوگی کہ جس طرح چہرہ کعبہ کی جانب متوجہ رہا قلب بھی رب کعبہ کی جانب متوجہ اور جس طرح جسم حالت نماز میں ظاہری نجاستوں سے پاک رہا روح بھی باطنی آلائشوں اور پریشان خیالوں سے پاک رہے۔

مذکورہ صدر بیان کی تائید میں بخاری شریف کی مشہور حدیث کو جو اہل علم میں حدیث جبرائیل کے نام سے مشہور ہے پیش کی جارہی ہے حضرت جبرائیلؑ نے حضور ﷺ سے پوچھا اسلام کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرے اور نماز قائم کرے اور فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان المبارک کے روزے رکھے۔(صحیح البخاری 21:1)

3) **احسان**

احسان سب سے اعلیٰ اور تیسرے نمبر پر ہے احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس تصور کے ساتھ کہ اس کے حسن مطلق کے جلوؤں کا نظارہ کر رہے ہو اور تمہیں اس بے مثل و بے عدیل ذات کا وصال نصیب ہو رہا ہے اگر اس اعلیٰ کیفیت تک رسائی نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تصور تو ضرور ہو کہ خدائے علیم وخبیر تمہیں دیکھ رہا ہے اور جس طرح تم عبادت کر رہے ہو اس کی نظریں تم پر ہیں۔

مذکورہ بیان کی تائید میں بخاری شریف کی مشہور حدیث کو پیش کیا جا رہا ہے جسے اہل علم اور محدثین حدیث جبرائیل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔حضرت جبرائیلؑ نے آپ حضورﷺ سے پوچھا احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اس طرح خدا کی عبادت کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے۔پس اگر تو خدا کو نہیں دیکھ رہا تو خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

تصوف کے مقاصد(Aims of Sufism)

تصوف کے مقاصد وہی مقاصد ہیں جو شریعت اور طریقت کے ہیں اس کا سب سے اہم مقصد ہے اللہ کی یاد میں خود کو مشغول رکھنا۔ جو بھی شے اللہ کی عبادت میں خلل پیدا کرے اسے روک دینا،تصوف کے مقاصد کو ہم مندرجہ ذیل نکات سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

1) تزکیۂ نفس

2) تصفیۂ قلب

3) طریقت

4) فنا و بقا

5) معرفت ربانی

1) **تزکیۂ نفس:**

تزکیۂ کے لفظی معنی ہیں پاکی۔نفس انسانی میں حیوانی قوتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔اس کے برعکس روح ملکوتی قوتوں کی مظہر ہے۔نفس کے ذریعے تمرّد(سرکشی یا بغاوت) انحراف کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔اس لیے قرآن حکیم اس حقیقت کی نسبت صراحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کرتا ہے۔وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا اور اپنے رب کا نام پکارا اور نماز ادا کی۔(الاعلی،87:14-15)

شیخ ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ ''نقصان کا آغاز غفلت سے ہوتا ہے۔اور غفلت آفات نفس سے پیدا ہوتی ہے''(قوت القلوب 174:1)۔اس لیے آفات نفس سے نجات و ملاح اس کے تزکیہ و تربیت اور اصلاح و تطہیر ہی سے ممکن ہے۔تصوف نفس کی اصلاح و تطہیر(پاکی) کا اہتمام کرتا ہے۔اور جب نفس انسانی اصلاح پذیر ہو کر مزکی و منقاد یا فرماں بردار ہو جاتا ہے۔تزکیہ نفس کو حدیث میں ''جہاد اکبر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تزکیہ نفس چہار گانہ فرائض نبوت میں شامل ہے۔اللہ پاک نے قرآن حکیم میں فرمایا آپ ﷺ تلاوت فرماتے ہیں ان پر اس کی آیات کی اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

2) **تصفیۂ قلب:**

تصفیہ کے لفظی معنی ہیں صاف کرنا واضح کرنا،صفائی تصوف میں تصفیۂ قلب ایک اہم مقصد ہے اس کا مقصد ہے اعمال قبیحہ کے ارتکاب سے قلب انسانی پر سیاہی و ظلمت غالب آجاتی ہے۔اور اس طرح باطن تاریک ہو جاتا ہے۔اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تصفیۂ تجلیہ باطن یعنی باطن کو

روشن کرنے کا اہتمام کیا جائے تا کہ قلب انسانی اور معرفت الٰہی کا منبع وسرچشمہ بن سکے اللہ پاک قرآن حکیم میں فرماتے ہر گز نہیں بلکہ ان کے کسب کی بنا پر ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔

3) طریقت:

صوفیاء کرام نے شریعت وطریقت کو ہمیشہ لازم وملزوم قرار دیا ہے۔اس موقف کی تائید میں چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

امام مالک بن انس فرماتے ہیں جس نے علم فقہ حاصل کیا اور تصوف سے بے بہرہ رہا پس وہ فاسق ہوا اور جس نے تصوف کو اپنایا مگر فقہ کو نظر انداز کر دیا وہ زندیق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا پس اس نے حق کو پالیا۔(مرقاۃ المفاتیح،1:256)

اما ابوالقاسم القشیر ی فرماتے ہیں جس شریعت کو حقیقت کی مدد حاصل نہ ہو وہ غیر مقبول ہوتی ہے اور جو حقیقت شریعت سے مقید (پابند) نہ ہو وہ غیر حاصل رہتی ہے۔(العرسائقہ لقشیر یہ 43)

4) فنا وبقا:

اللہ رب العزت کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی ہمیشہ رہنے والا ہے فنا و بقا کے تصورات کی اساس ہے۔حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں فنا کے مقامات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جہاں کی ابتدا عدم سے ہوئی اور انتہا عدم پر ہے۔اور جو ان دونوں صورتوں کی درمیان ہے وہی بقا ہے۔ بقا سے مراد دوام وابدیت وجود ہے۔وہ علم جو اس دنیا میں فانی ہے اور باقی علم وہی ہے جو کہ اخرت کی زندگی میں دارومدار رکھتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اہل ولایت بقا و فنا کے علم کو تصوف کا ایک درجہ کمال جانتے ہیں اور اسے اس مقام کے سوا اور کہیں استعمال نہیں کرتے۔

اہل صفا مقام حال کے تغیرات سے رہائی اور مطلوب کے حاصل کر لینے کے بعد فنا کو پہنچتے ہیں اور وہ ہر محسوس شے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جو باصرہ اور سامعہ کے راستے ان پر وارد ہوتی ہے۔فنائیت کے اس درجے میں وہ اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ خواہشات کا کانٹا بھی ان کے دل سے یکسر نکل جاتا ہے حتیٰ کے صادر ہونے والی کرامتیں بھی ان کے نزدیک حجاب بن جاتی ہیں۔پھر اپنی خواہشات کی اپنے وجود سے نفی کر کے وہ اپنے اوصاف کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔اوصاف کا فنا کر دینا گویا بقائے دوام کا دروازہ ہے جس سے گزر کر ان کی فنا بقا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور وہ قرب وبعد ہوش ومدہوش اور فراق ووصال سب کیفیات سے بےخبر و بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

5) معرفت ربانی:

تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن پر اسی لیے زور دیتا ہے کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے۔قرآن حکیم نے انسانی تخلیق کی غرض وغایت ہی ''معرفت رب'' کو قرار دیا ہے۔معرفت ربانی وہ امتیاز خوبی ہے جس کے ذریعے عارف و غیر عارف کے مابین تمیز ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھر اپنی اساس پر قائم ہوتا ہے۔اور دین کی اساس خدا کی معرفت اور اس کا یقین ہے۔

صوفیائے کرام کا نقطہ یہ ہے کہ معرفت حق کا واحد ذریعہ معرفت نفس ہے اس لیے تصوف کی جدوجہد معرفت ہے اور نتیجہ معرفت حق۔

تصوف یا صوفی کا فلسفہ تعلیم:

صوفی فلسفہ کے مطابق سچا علم، ہمیشہ رہنے والی روشنی اور سب سے اعلیٰ حسن و جمال یعنی اللہ کا حسن و جمال یہ سب ہمیں فطرت میں نظر آتے ہیں۔دنیا کی حقیقت ایک دھوکا ہے یا یہ کہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے ان کے مطابق اصل اور حقیقت انسانی علم سے اوپر ہے۔دنیا کے

نظام میں ایک پیدا کرنے والا خالق ہے اور دوسری تمام جو پیدا کی گئی سب مخلوق ہے۔مخلوق کو دیکھ سکتے ہیں لیکن خالق کو نہیں۔انسان کے اندر خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔لیکن یہ مکمل اور صحیح نہیں ہوتی۔انسان خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کی خوبصورتی اتنی مکمل نہیں ہوتی۔وہی خدا کی خوبصورتی سب سے اعلیٰ اور مکمل ہے۔اور اس کی اس خوبصوری سے محبت ہے اس لیے صوفی محبت کی بات کرتے ہیں۔عشق الٰہی سے اللہ تک پہنچنے کا طریقہ اپناتے ہیں۔تصوف میں اللہ اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا بہت اہم ہے۔اس فلسفے کے مطابق دنیا کی تخلیق محبت پر مبنی ہے۔اس کے مطابق دنیا کی تمام اشیا فنا ہونے والی ہیں اور باقی رہنے والی اشیا ہے علم اور اللہ کی محبت۔جس نے خدا سے حقیقی محبت کی اس نے دنیا کی طلب اور خواہش کو کم کیا۔صوفی دنیا میں اس طرح رہتا ہے۔جیسے پانی میں بلبلے۔دریا میں حباب ہوتا ہے۔لیکن دریا کا پانی اس کے اندر نہیں ہوتا ہے۔اسی طرح صوفی بھی دنیا میں موجود ہوتا ہے۔تمام کاروبار کرتا ہے لیکن دنیا ان کے اندر نہیں ہوتی۔مولانا روم اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک صوفی کے پاس آیا اس نے اس صوفی سے کہا کہ حج کرنے چلتے ہیں۔اس صوفی کے پاس بہت بڑا باغ تھا بہت سارے کام کرنے والے تھے۔آپ نے اس کی بات سنی اور مصلیٰ کاندھے پر ڈالا اور کہا چلیے۔اس شخص نے کہا سامان سفر بھی تو رکھنا ہوگا۔آپ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو بلایا کچھ سمجھایا کام کرنے والوں کو کوئی ہدایت دی۔کچھ نہیں کیا اور اللہ کی طرف چل پڑا۔یعنی جب اللہ کی طرف چلنا ہے تو دنیا کی تمام شے کو بھول جانا ہے۔

صوفی فلسفے کے مطابق انسان کی تخلیق کا اہم مقصد ہے خدا کو جاننا یعنی خدا کے بارے میں علم حاصل کرنا۔خدا کو جاننے سے مراد ہے تخلیق کرنے والے اور تخلیق کی ہوئی تمام شے کا علم حاصل کرنا۔اس میں انفرادی انسان سے لے کر تمام کائنات شامل ہے۔خدا کو جاننے کا راستہ ہے روح اور دنیا کی تمام چیزوں کا علم حاصل کرنا۔

اس فلسفے کے مطابق خدا کے حقیقی علم کو الہام وجدان سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔صوفی کے مطابق انسان کا دل ایک آئینہ ہے۔جس میں وہ اللہ کی بصارت کو دیکھ سکتا ہے۔لیکن جب انسان کا دل دنیا کی خواہش اور لالچ سے آلودہ یا ناپاک ہو جاتا ہے تو اس کے اس آئینہ میں شکل نہیں دکھائی دیتی اور وہ بصارت سے محروم ہو جاتا ہے۔صوفی اس دنیاوی حوس اور لالچ کو نفس کہتے ہیں۔نفس ایک لمحے کے لیے بھی ختم نہیں ہوتا۔اس لیے اسے ختم کرنے کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔

1) دنیا کی محبت کو دل سے نکالنا اور اللہ کی محبت کو دل میں قائم کرنا۔

2) اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے مراقبہ اور محاسبہ کرنا۔

3.71 صوفی یا تصوف اور طریقۂ تدریس

صوفی جس طریقۂ تدریس کو اپناتے ہیں وہ طریقۂ تدریس پوری طرح سے تعلیمی نفسیات پر مبنی ہے۔صوفیوں نے تعلیم فراہم کرنے کے لیے خانقاہ قائم کی اور ہر شخص کو انفرادی طور پر تعلیم دی۔صوفی کے پاس جو بھی آتا وہ اس کی انفرادیت کو سمجھتے اور اسی کے مطابق اسے تعلیم دیتے تھے۔ان کے طریقۂ تدریس کے مندرجہ ذیل طریقے تھے۔

1) حلقہ یا گروہی طریقۂ تدریس

2) انفرادی طریقۂ تدریس

3) عملی طریقۂ تدریس

1) حلقہ یا گروہی طریقۂ تدریس

اس قسم کے طریقۂ تدریس میں شیخ یا معلم کے چاروں طرف ایک حلقہ میں طلبا بیٹھ جاتے اور شیخ کے ساتھ قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرتے اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔اس طریقے میں معلم اپنے طلبا کو صحیح تلفظ اور اس کے معنی سمجھاتے ہیں۔آج کل اسے Study Circle کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ طریقہ سب سے جدید طریقہ معنی جاتا ہے۔یہ طریقہ کار تمام خانقاہوں میں آج بھی رائج ہے۔حضرت نظام الدین اولیا کی خانقا میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے ایک حلقہ نظام المشائخ قائم کیا۔

اس بات کو سن کر علامہ اقبال نے 12/ اکتوبر 1918 کو خواجہ حسن نظامی کو ایک خط لکھ کر خوشی ظاہر کی۔آپ نے لکھا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا۔

2) انفرادی طریقۂ تدریس

انفرادی طریقۂ تدریس وہ تدریس ہے جس میں معلم طلبا کو اس کی نفسیاتی حالت کو سمجھ کر تدریس کرتے ہیں۔انفرادی طریقۂ تدریس ان طلبا کے لیے بہت مفید ہوتا ہے جو طلبا شرمیلے ہوتے ہیں ایسے طلبا معلم سے تنہائی میں اپنی بات کو مکمل طور پر بیان کرتے ہیں اور اپنے مسائل کو حل کرنے میں معلم کی مدد کرتا ہے۔اسی طرح شیخ اپنے طلبا کو تنہائی میں ان کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان کی رہبری کرتے ہیں۔شیخ طلبا کی نفسیات کو سمجھ کر ان کو اس کی سمجھ اور ادراک کے مطابق رہبری کرتے ہیں۔طلبا کے تلفظ صحیح کرتے ہیں قرآن اور حدیث کو سمجھاتے ہیں تا کہ طلبا کو صحیح علم حاصل ہو سکے۔

3) عملی طریقۂ تدریس

عملی طریقۂ تدریس سے مراد ہے جس قدر علم رکھو اس پر عمل کرو۔تعلیم کی معرفت تعریف ہے کہ تعلیم انسان کے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔صوفی اپنی خانقاہ میں طلبا کو سیکھے ہوئے علم پر عمل کرنے کا درس دیتے ہیں۔مثال ہم سب جانتے ہیں اور پڑھتے ہیں کہ پلاسٹک کا استعمال ماحول کو خراب کرتا ہے۔لیکن ہم سب اس کا استعمال کرتے ہیں۔اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علم حاصل کرنا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔اسی لیے صوفی اپنی خانقاہوں میں سیکھے ہوئے علم پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔

تصوف اور نظم وضبط

صوفی کی درس وتدریس میں نظم وضبط ادب سے پیدا کیا جاتا ہے۔وہ طلبا کو کسی بھی طرح کی جسمانی سزا کے خلاف تھے۔تصوف میں طلبا کے اندر شیخ سے محبت کے ذریعے ادب پیدا کیا جاتا ہے۔شیخ کے اپنے اخلاق، کردار شفقت اور محبت سے طلبا میں نظم وضبط خود بہ خود پیدا طلبا ہو جاتا ہے۔طلبا اپنے معلم یا مرشد سے رہبری اور باطنی علم حاصل کرتے ہیں۔مرشد اپنے طلبا میں اعلیٰ اخلاق اور کردار پیدا کرتے ہیں۔ان کے اندر ایسے اخلاق پیدا کرتے ہیں کہ طلبا خانقاہ میں اس طرح کا نظم وضبط قائم رکھتے ہیں کہ کسی بھی طرح کے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔شیخ کے طلبا کسی بھی عمر کے ہو سکتے ہیں۔یہاں ایک غیر رسمی تعلیم دی جاتی ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے۔

تصوف اور معلم

تصوف کی تدریس اللہ کی یاد میں فنا کرنے والی ہوتی ہے۔اسلیے یہاں معلم ایک مرشد اور شیخ ہوتا ہے۔شیخ اپنے طلبا کو روحانی علم سے روشناس کراتا ہے۔معلم طلبا کو اس کی صلاحیت کے مطابق علم فراہم کرتا ہے طلبا اپنے معلم کو اپنا رہبر، دوست اور والد کی طرح مانتے ہیں اس لیے معلم یا شیخ کا درجہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔طلبا اپنے معلم کو روحانی شیخ مانتے ہیں۔معلم اپنے طلبا کو دینی اور روحانی علم دیتا ہے۔اس لیے اس سے

روحانی لگاؤ ہوجاتا ہے۔طلبا اپنے معلم کی بات کو مکمل طور پر اپناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کوشش کرتے ہیں۔شیخ کی نگاہ میں تمام طلبا مساوی ہوتے ہیں۔نہ کوئی امیر نہ کوئی غریب ہوتا ہے۔سبھی ایک ساتھ رہتے ہیں۔اور ایک ساتھ درس سنتے ہیں۔معلم طلبا کو مختلف قسم کے طریقہ ہائے تدریس کے ذریعے طلبا کی نشو ونما کرتے ہیں۔اس طرح معلم کا مقام بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔تمام طلبا اپنے شیخ کا بہت ادب اور احترام کرتے ہیں۔

تصوف یا صوفی ازم اور نصاب

نصاب کا پورا فلسفہ دین اسلام پر مبنی ہے اس لیے ان کے نصاب میں مندرجہ ذیل مضامین ہوتے ہیں۔

1) قرآن

2) حدیث

3) فقہ

4) اردو عربی فارسی اور مقامی زبانیں۔

صوفی اپنی خانقاہ میں طلبا کو قرآن پڑھنا اور سمجھنا سیکھاتے ہیں۔قرآن کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرایا جاتا ہے تاکہ طلبا شریعت کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔اس کے ساتھ ساتھ فقہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔اس سے طلبا کو اسلامی قانون کا علم حاصل ہوتا ہے۔ان کے ساتھ ساتھ مقامی زبانیں اور جدید تعلیم کے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔آج بھی تمام خانقاہوں میں دینی اور جدید تعلیم کا درس دیا جاتا ہے۔اس طرح تصوف یا صوفی ازم میں دی جانے والی تعلیم اسلام سے الگ نہیں بلکہ ایک ہی سکے دو پہلو ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. لفظ صوفی کا ارتقا کیا ہے؟
2. لفظ الصفا کے معنیٰ کیا ہیں؟
3. الصوف سے کیا مراد ہے؟
4. علامہ ابن خلدون لفظ الصوف کی تائید میں کیا کہتے ہیں لکھیے؟
5. لفظ الصفہ کی تائید میں شیخ احمد الحسینیؒ کیا فرماتے ہیں بیان کیجیے؟
6. تصوف سے آپ کیا سمجھتے ہیں تفصیل سے وضاحت کیجیے؟
7. تصوف یا صوفی ازم کے مقاصد کیا ہیں تفصیل سے لکھیے؟
8. دو عالم دین نے کیوں اور کیسے پہلی خانقاہ قائم کی تفصیل سے لکھیے؟
9. صوفی ازم کے تعلیمی فلسفے کو بیان کیجیے؟

3.4 مغربی فلسفۂ مکاتب (Western Schools of Philosphy)

اس اکائی میں فطریت ،تصوریت ،عملیت ، وجودیت کے مابعد الطبیعیات ،علمیات اور اقداریات کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

اوران کے تعلیمی مضمرات پر غور کیا جائیگا۔

مقاصد: اس ذیلی اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1) فطریت، تصوریت، عملیت اور وجودیت جیسے مکاتب فکر کی بنیادیں بیان کرسکیں۔

2) فطریت، تصوریت، عملیت اور وجودیت کے مابعد الطبیعیات کے مسائل پر روشنی ڈال سکیں۔

3) فطریت، تصوریت، عملیت اور وجودیت کے علمی (Problems Epistemological) مسائل کی وضاحت کرسکیں۔

4) فطریت، تصوریت، عملیت اور وجودیت کے قدر یاتی مسائل (Axiological Problem) کی وضاحت کرسکیں۔

5) فطریت، تصوریت، عملیت اور وجودیت کے تعلیمی مضمرات (Educational Implications) بیان کرسکیں۔

3.4.1 تصوریت (Idealism)

تصوریت انسان کے علم کی تاریخ کا قدیم ترین نظام فلسفہ ہے۔ مشرق میں اس کا آغاز قدیم ہندوستان سے ہوتا ہے۔ جب کہ مغرب میں افلاطون (Plato) سے ہوتا ہے۔ فلسفہ تصوریت اس نظریے پر مبنی ہے کہ تصورات یعنی Ideas ابدی ہوتے ہیں۔ انہیں کے ذریعے ہم مادی چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

فلسفہ تصوریت کے اہم فلاسفہ (Prominent Idealist Philosophers)

1)	افلاطون (Plato)	2)	سقراط (Socrates)
3)	ہیگل (Hegel)	4)	کانٹ (Kant)
5)	اسپنوزا (Spinoza)	6)	ٹیگور (Tagore)
7)	گرونانک (Gurunanak)	8)	گاندھی جی (Gandhiji)
9)	سوامی وویکانند (VivekanandaSwami)	10)	ڈاکٹر رادھا کرشنن (Dr. Radha Krishnan

فلسفیانہ پیش قیاسی (Philosophical Pre-Suppositions)

1) فلسفہ تصوریت کی مابعد الطبیعیات Metaphysics of Idealism

تصوریت ذہن کو حقیقت مانتا ہے۔ تصوریت میں حتمی حقیقت ذہن/ خیال/ سوچ/ روح ہے۔

2) فلسفہ تصوریت کا نظریہ علم Epistemology of Idialism:۔

حقیقی علم کے نتائج استدلال ہے۔ تصوریت کے مطابق حقیقت Spiritual World میں ہے نہ کہ مادی دنیا (Material World) میں۔

3) فلسفہ تصوریت اور علم الاقدار Axiology of Idealism

تصوریت میں اقدار عالم گیر (Universal) ہیں اور تبدیل ہونے والی نہیں ہیں۔ سچائی، اچھائی اور خوبصورتی عالم گیر قدریں ہیں۔

تصوریت کی تعریف(Definition of Idealism) :

فلسفہ تصوریت، بہت ساری اور متنوع شکلیں اختیار کرتا ہے لیکن ان سب کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ ذہن یا روح دنیا کا لازمی مادہ ہے اور یہ کہ اصل حقیقت ذہنی کردار ہے۔

Idealist philosophy takes many and varied forms, but the postulate underlying all this is that mind or spirit is the essential world-stuff, that true reality is of a mental character. (Ross)

فلسفہ تصوریت، اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ حقیقت، خیالات، تصورات (Ideas)، ذہن اور نفس پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ مادی چیزوں اور قوت پر۔

Idealism asserts that reality consists of ideas, thoughts, minds, or selves rather than material objects and force. HaroldB.Titus

تصوریت کی اہم خصوصیات(Salient features of Idealism)

1) تصوریت کے مطابق تصورات ابدی اور کلی اہمیت کے حامل ہیں۔

2) تصوریت کے مطابق روحانی علم ہی حقیقی علم ہے۔

3) تصوریت میں پہلے ذہن کا مقام ہے اس کے بعد مادی چیز ہیں۔

4) تصوریت کے مطابق ذہن کا وجود حقیقی ہے۔

5) زندگی کی اعلیٰ اقدار کا حصول تصوریت کا مقصد ہے۔

6) تین حقیقی اقدار ہیں سچائی، اچھائی اور خوبصورتی۔

تصوریت اور تعلیمی مقاصد (Idealism and Aims of Education)

1) شخصیت کا فروغ Development of Personality

2) حصول خودی Self-Realisation

3) آفاقی تعلیم Universal Education

4) اخلاقی تعلیم Moral Education

تصوریت اور نصاب (Idealism and Curriculum)

1) نصاب میں ادب، تاریخ، فنون لطیفہ، اخلاقیات، ریاضی، ثقافت، سماجی علوم، مذہبیات جیسے مضامین شامل ہیں۔

2) اس نظریے کے مطابق انسان کو اعلیٰ اقدار سے روشناس کیا جائے۔

3) تصوریت کا نصاب ایسا ہو کہ وہ انسانیت کے فروغ کا موجب بنے اور بچے کے اندر ذہنی، اخلاقی اور مذہبی اقدار فروغ پائیں۔

تصوریت اور طریقہء تدریس (Idealism and Methods of Teaching)

1) مباحثے کا طریقہ (Discussion Methods)

2) بیانیہ طریقہ (Lecture Methods)

3) سوال وجواب کا طریقہ (Question and Answer Method)

4) استقرائی طریقہ (Inductive Method)

تصوریت اور نظم وضبط (Idealism and Discipline)

نظم وضبط بیرونی دباؤ سے قائم نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اپنے طور پر تحریک پا کر ہونا چاہیے۔ نظم وضبط سے بھری زندگی نظم وضبط کا حامل دماغ تیار کرے گی۔ Hegel اور Kant کے بموجب تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ بچوں میں نظم وضبط پیدا کرسکے اور اس بات کے احکام کی پابندی کی جائے جب کہ Froebel کے نزدیک محبت، تجربہ، اخلاق نظم وضبط کے عناصر ہیں۔

تصوریت اور اسکول: (Idealism and School)

فلسفۂ تصوریت اسکولوں کے مثالی ہونے کی وکالت کرتا ہے۔ وہاں کے اساتذہ کے اعمال واخلاق Immitate کرنے کے لائق ہو اور اسکول میں بچوں کی ہمہ جہت ترقی ہو اور ان کے اندر سچائی، اچھائی اور خوبصورتی کے اقدار پیدا ہو۔

تصوریت اور معلم (Idealism and Teacher)

1) معلم طلبا کے لیے نمونہ (مثالی شخصیت) ہوتا ہے۔ طلبا میں قوت فیصلہ، خود اعتمادی، مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

2) معلم طلبا کا روحانی باپ ہوتا ہے۔

3) معلم اعلیٰ کردار کی حامل شخصیت کہلاتا ہے۔ وہ ایک مثالی نمونہ ہونا چاہیے تاکہ طلبا اس سے سیکھیں۔

4) معلم دوستانہ تعلقات رکھنے والا، رہبر اور فلسفی ہونا چاہیے۔

تعلیمی مضمرات (Educational Implications)

1) بچے کو سب سے پہلے انسان (Human) بنانا ہے۔

2) اسکول معاشرے کے لیے ایک ایجنسی کی طرح کام کرے اور بچے شخصیت کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات کریں۔

3) تصوریت میں بچہ ایک روحانی وجود رکھتا ہے اور اس کی زندگی کا اہم مقصد خودشناسی (Self-Realisation) ہے۔

4) تصوریت میں ریاست (State) شخصیت کے مقابلے میں زیادہ قدر رکھتی ہے اور بچے کو ریاست (State) کے لیے تیار کرنا ہوگا۔

5) اسکول کو آفاقی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ تصوریت کی تعریف لکھئے اور کوئی پانچ مفکرین کے نام بتائیے۔

2۔ تصوریت کے مابعدالطبیعیات، علمیات اور اقداریات پر نوٹ لکھئے۔

3 ۔ آج کے دور میں تصوریت فلسفۂ کس حد تک مناسب ہے، اپنے الفاظ میں لکھئے۔

4۔ تصوریت کے تعلیمی مقاصد بیان کیجیے۔

5۔ تصوریت میں معلم کے کردار کو بیان کیجیے۔

6۔ تصوریت کے تعلیمی مضمرات پر روشنی ڈالیے۔

3.4.2 فطریت (Naturalism):

فطریت ایک قدیم مکتبہ فکر ہے۔ یہ فطرت کو مکمل مانتا ہے۔ انسان کی تخلیق اور فطرت میں اس کے مختلف کی نوعیت اور ان کے احساسات حیرت اور مختلف موضوعات سے آہستہ آہستہ فطریت کی تشکیل ہوئی اور فطریت کے بانی روسو (Rousseau) ہے۔

فطریت کے اہم فلاسفہ: (Prominent Naturalism Philosophers)

1) لیوسی پس (leucippus) اور ڈیما کریٹس (پانچویں صدی قبل مسیح)

2) اپی کیورس (Epicurus) قبل مسیح (341-270)

3) لیوکرٹس (Lucrtius) قبل مسیح (96-55)

4) تھامس ہابس Thomas Hobbes (1588-1697)

5) جے جے روسو J.J. Rousseau (1712-1778)

6) ہربرٹ اسپینسر Herbert Spenser (1820-1903)

فلسفیانہ پیش قیاسی: (Philosophical pre-suppositions)

1) فلسفہ فطریت کا مابعد الطبیعیات (Metaphysics of Naturalism)

فطریت میں حتمی حقیقت (Ultimate Reality) فطرت ہے اور مادیت سے پرے کوئی چیز نہیں ہے۔

2) فلسفہ فطریت کا نظریہ علم (Epistemology of Naturalism)

علم حسی اعضا کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ حسی اعضا حصول علم کے دروازے ہیں

3) فلسفہ فطریت اور علم الاقدار (Axiology of Naturalism)

فطریت زندگی کے اقدار سے جڑا ہوا ہے۔ انسان اپنی متعین ضرورتوں کے مطابق اقدار کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان کو فطرت میں رہ کر اپنی زندگی کو فطرت سے ہم آہنگ کرنا ہوگا ہے۔

فطریت کی تعریف (Definition of Naturalism):

فطریت وہ نظریہ ہے جو فطرت کو خدا سے الگ کرتا ہے۔ روح کو طبعی عنصر کے ماتحت مانتا ہے۔ اور قوانین کو برتر بناتا ہے۔ (وارڈ)

Naturalism is a doctrine which separates nature from God, subordinates spirit to matter and sets up laws as supreme (Ward).-

روسو (Rousseau) کے مطابق ہر شے اچھی ہے۔ جب وہ فطرت کے خالق کے ہاتھوں سے آتی ہے اور ہر شے انسان کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے۔

فطریت کی اہم خصوصیات (Characteristics of Naturalism)

1. فلسفہ فطریت، فطرت کی طرف واپس ہونے پر زور دیتا ہے۔
2. بچہ تعلیم کے لیے نہیں ہے، تعلیم بچے کے لیے ہے۔ اس لیے تعلیم بچے کو مرکز مان کر دی جاتی ہے اسی کو طفل مرکوز تعلیم کہتے ہیں۔
3. فلسفہ فطرت کے مطابق بچوں کو تعلیم الفاظ کی شکل میں نہیں بلکہ عملی طور پر دی جائے اور بچوں کو خود کر کے سیکھنے اور تجربات کے ذریعے اپنی رفتار سے تعلیمی ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔
4. لڑکے اور لڑکیوں کو علاحدہ تعلیم نہیں بلکہ ان کو اجتمائی طور پر تعلیم دینی چاہیے۔
5. بچوں کو آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے۔
6. بچوں کو فطرت کی کتاب سے حسی اعضا کے ذریعے تجربات پر مبنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے راغب کیا جائے۔
7. فطرت تمام علوم کا ذریعہ ہے۔
8. مادی دنیا حقیقی دنیا ہے۔
9. ذہن مادہ کے ماتحت ہے۔
10. تمام اقدار فطرت میں موجو ہیں۔

فطریت کی قسمیں: (Forms of Naturalism)

1) طبعی فطریت (Physical Naturalism)

2) مکانیکی فطرت (Mechanical Naturalism)

3) حیاتیاتی فطریت (Biological Naturalism)

فطریت اور تعلیمی مقاصد (Naturalism and Aims of Education)

1) بچے میں اظہار خودی کی صلاحیت پیدا کرنا۔

2) بچے کو اطراف کے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے قابل بنانا۔

3) بچے کو زندگی کی جدو جہد کے لیے تیار کرناہ

4) بچے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا۔

5) بچے کی مکمل انفرادیت فروغ دنیا۔

فطریت اور نصاب (Naturalism and Curriculum)

نصاب میں سائنس کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ علم فلکیات، جغرافیہ، پیشہ وارانہ تعلیم، ریاضی، زبان، تاریخ، امورِ خانہ داری، جسمانی تعلیم فطریت میں ہم نصابی سرگرمیاں بچے کے ارتقائی مراحل اور اس کی دلچسپی کے مطابق منتخب کی جاتی ہیں۔ فطریت کا نصاب لچکدار اور طفل مرکوز ہوتا ہے۔

فطریت اور طریقۂ تدریس (Naturalism and Methods of Teaching)

1) عمل کے ذریعے اکتساب   2) تجربات کے ذریعے اکتساب

3) انکشافی طریقہ   4) کھیل کے ذریعے تدریس

5) انفرادی تدریس

فطریت اور نظم وضبط (Naturalism and Discipline)

1) فطریت میں بچوں کو مکمل آزادی دی جاتی ہے۔

2) نظم وضبط (Self-Discipline) پر زور دیا جاتا ہے۔

3) Self-Governance خود انتظامیہ سے سیکھتا ہے۔

فطریت اور معلم (Naturalism and Teacher)

1) استاد کی حیثیت ثانوی ہے۔

2) استاد کا کام یہ ہے کہ بچوں کے فطری فروغ کے لیے مناسب ماحول تیار کرے۔

3) استاد ایک نگہبان اور مشاہد کار کی طرح ہے۔

فطریت اور اسکول (Naturalism and School)

اسکول ایسے ہونا چاہیے جہاں بچے کو آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے اور فطری اور ہمہ جہت نشونما پر زور دیا جائے۔ بچے کو اپنی دلچسپیوں اور خواہشات کے مطابق تعلیم ملنی چاہیے۔

تعلیمی مضمرات (Educational Implications)

1) تعلیم فطری عمل اور ذہنی ترقی کے مطابق ہونی چاہیے۔

2) تعلیم خوش گوار ماحول میں دی جانی چاہیے۔

3) بچے کو تعلیم مسلسل خود سر گرمیوں کے ساتھ دی جانی چاہیے۔

4) حصول علم تعلیم کا ایک حصہ ہے۔

5) بچے کے ذہن اور جسم کے نشونما کے لیے تعلیم دی جانی چاہیے۔

6) استقرائی طریقۂ تدریس پر زور دیا جانا چاہیے۔

7) بچے کی غلطی پر سزا فطری نتائج پر مبنی ہونی چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ فطریت کی تعریف لکھیے اور اس کے بانی کا نام بتایے۔

2۔ فطریت کے مابعد الطبیعیات، علمیات اور اقداریات پر نوٹ لکھیے۔

3۔ آج کے دور میں فطریت فلسفہ کس حد تک مناسب ہے، اپنے الفاظ میں لکھیے۔

4۔ فطریت کے تئیں تعلیمی مقاصد بیان کیجیے۔

5۔ فطریت میں معلم کے کردار اور طریقۂ تدریس کو بیان کیجیے۔

6۔ فطریت کے تعلیمی مضمرات پر روشنی ڈالیے۔

3.4.3 فلسفۂ عملیت (Pragmatism)

اب تک آپ مغربی فلسفۂ تعلیم کے تحت فلسفۂ تصوریت اور فلسفۂ فطریت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس اکائی میں فلسفۂ عملیت (Pragmatism) کا مطالعہ کیا جائے گا۔ موجودہ دور کے نظام تعلیم پر اس فلسفے نے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اس لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کا شمار جدید فلسفوں میں ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھولنے میں امریکہ کے ماہرین کی گراں قدر خدمات کی وجہ سے اسے امریکی فلسفہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ فلسفۂ عملیت کے مطابق تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں کسی بھی چیز کو ثبات حاصل نہیں ہے۔ ہم حقیقت اولیٰ کا علم حاصل نہیں کر سکتے یا یہ ہمارے لیے ناممکن ہے۔ مفروضات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر ہم قریب ترین علم حاصل کر سکتے ہیں۔ فلسفۂ عملیت کے مطابق انسان کے تمام مسائل کا حل سائنسی طریقے اور تجربات کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ فلسفہ کسی بھی تصور کے معانی اور مفہوم معلوم کرنے کے لیے اسے تجربے سے گذار کر حاصل ہونے والے نتائج کو ذریعہ بناتا ہے۔ اس فلسفے نے جدید دور کے تعلیمی نظام کو نہ صرف امریکہ بلکہ دیگر ممالک میں بھی غیر معمولی حد تک متاثر کیا ہے۔

Pragmatism یہ لفظ یونانی لفظ Pragma کے مادے سے نکلا ہوا ہے جس کے معانی Practical یعنی عمل کے ہیں۔ یہ فلسفہ عملی زندگی کے تجربات کو ہی حقیقت تسلیم کرتا ہے ان کے نزدیک ''تجربہ ہی تمام اشیا کی کسوٹی ہے''۔

ماہرین، فلسفۂ عملیت کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے ہیراکلٹس Heraclitus تک پہنچتے ہیں۔ اس کا دور 530 تا 570 قبل مسیح کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں ہمیں صوفسٹ (Sophist) گروہ کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے اسکول اور کارگاہ کے درمیان کی دوری کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کئی صدیوں کا سفر طے کر کے ہمیں جان ڈیوی، فرانسس بیکن (1561-1626) کو اس کے بانیوں میں شامل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد مشہور فرانسیسی فلسفی اگسٹ کومٹے (1798-1857) کا نام بھی اس فلسفے کے مبلغین میں شمار کیا جاتا ہے۔ تین امریکیوں یعنی چارلس سینڈرس پیرس، ولیم جیمس اور جان ڈیوی نے اس فلسفے کو گویا بام عروج تک پہنچایا، اس نے نہ صرف تعلیم کو بلکہ امریکی سماج کو اس قدر متاثر کیا کہ امریکیوں کی شناخت اب عملیت پسندوں کی ہوگئی۔

اب ہم اختصار سے فلسفۂ عملیت کے تین اہم عنوانات کے تحت مطالعہ کریں گے۔

مابعدالطبیعیات (Metaphysics)

جان ڈیوی نے اپنی کتاب تخلیقی ذہانت (Creative Intellegence) میں واضح الفاظ میں کہا کہ ''عملیت پسندی میں کسی حقیقت کبریٰ (reality) کی عموماً نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے''۔ چوں کہ عملیت کا سارا زور اشیا کو تجربے کے نتائج کے ذریعے سمجھنے کا ہے اس لیے وہ باتیں جن سے مابعدالطبیعیات پر بحث کرنی ہے اور جسے ہم تجربے کی کسوٹی پر پرکھ نہیں سکتے۔ وہ ان کے نزدیک خارج از بحث

ہو جاتی ہے۔ دنیا اور انسان کی حقیقت کے بارے میں اس فلسفے کے خیالات ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

(1) دنیا ہمارے لیے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ اس دنیا کا کوئی پس منظر نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کریں (جیسے تصور میں دو حصے ہوتے ہیں ایک اس کا اہم قابل توجہ پہلو اور دوسرا وہ پس منظر جس میں وہ شے نظر آتی ہے)

(2) اعمال اور تبدیلیاں اس دنیا کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں جتنے تجربات سے دوچار ہوتے ہیں ان کی مثال ایک ندی کی سی ہے جو ہمیشہ رواں دواں اور تبدیلیوں سے دوچار رہتی ہے۔ گویا عملیت پسند کسی بھی شے یا قدر کے ثبات یا اس کے مستقل ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

(3) دنیا ایک غیر یقینی جگہ ہے جو ہر وقت اتفاقات اور ہنگامی حالات سے دوچار رہتی ہے۔ یہاں پر کوئی محفوظ نہیں ہے اور ہمیں ہر وقت ناگہانی حالات کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(4) دنیا نامکمل ہے اور اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ گویا اس دنیا کے ارتقا کا عمل جاری ہے۔ عملیت پسند انسان کو اختیار کی آزادی سے محروم سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے تجربات کی بنیاد پر ان حالات کے رخ تبدیل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

(5) دنیا ایک تکثیری حالت میں ہے۔ یعنی فلسفیانہ انداز میں کہا جائے تو وہ حالت جس کی رو سے حقیقت کی پوری تعمیر کسی ایک اصول پر نہ کی جا سکے۔ اس کی تشریح میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ ہر آن تبدیل ہوتی دنیا اور اس کائنات کے نظام میں کوئی ربط نہیں ہے۔ کوئی ایسی وحدت (Monoism) نہیں ہے جو اس کے نظام کو ایک لڑی میں پرو سکے۔

(6) دنیا کے اعمال کے اندر ہی ان کا انجام پوشیدہ ہے:۔ اس اصول کے ذریعے وہ یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ اغراض و مقاصد اور اقدار نہ عالمی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی زماں و مکاں سے بے نیاز۔ وہ صرف اور صرف عارضی اور وقتی ہوتے ہیں۔ گویا اقدار مستقل نہیں ہوتے۔ وہ ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ روحانیت اور مذہبیت کو رد کرتے ہیں۔

(7) دنیا میں کوئی حقیقت اولیٰ نہیں پائی جاتی:۔ اس اصول کے تحت وہ مذہب اور روحانیت کی نفی کرتے ہیں اس طرح ان کے نزدیک انسان کی زندگی صرف اسی دنیا تک محدود رہتی ہے۔ مرنے کے بعد دوسری دنیا کا ان کو یقین نہیں ہے۔

(8) انسان فطرت کا ایک جز ہے اور وہ اسی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ جان ڈیوی نظریۂ ارتقا کو درست مان کر انسان کو فطرت (Nature) کا ایک اٹوٹ حصہ مانتا ہے۔ وہ انسان کی اس فطرت سے ہٹ کر اعلیٰ اور ارفع تخلیق کو تسلیم نہیں کرتا۔

(9) انسان کی اس دنیا میں متحرک وجہ نہیں ہے:۔ فلسفہ کا ایک اہم سوال جبر و قدر کا ہے۔ یعنی انسان اپنے اعمال اور تقدیر میں آزاد ہے یا مجبور محض۔ عملیت پسند ان دونوں انتہاؤں کے بین بین موقف رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان محدود طور پر آزادی رکھتا ہے مگر اس میں دنیا کے حالات کو مخصوص رخ پر ڈالنے کی پوری طاقت نہیں ہے۔

(10) دنیا میں ہمیں ترقی کی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جس طرح اس سے پہلے کے اصول میں عملیت پسندوں نے درمیانی راہ اختیار کی تھی اسی طرح وہ یہاں پر یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں محفوظ طریقے سے ترقی حاصل کرنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ناامید ہو کر کوشش کرنا چھوڑ دیں۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کو ایک بہادر شخص کی طرح گذارے اور اس میں ان بلندیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کی وہ اپنے اندر صلاحیت پاتا ہے۔ وہ صرف کوششیں کرسکتا ہے متوقع نتائج اس کے

ہاتھ میں نہیں ہے۔

فلسفۂ عملیت کا نظریۂ علم (Epistemology of Pragmatism)

اس فلسفے کے نزدیک نظریۂ علم بنیادی طور پر اشیا کو کام میں لانا ہے تا کہ ان کی موجودہ قدر (Value) کو جانا جاسکے۔ ان کا علم کے بارے میں نظریہ روایتی فلسفوں سے کافی ہٹ کر ہے۔

ان کے نزدیک جاننے کے لیے صرف وجہ یا دلیل کافی نہیں ہے اور نہ ہی وہ حواس کو علم کا مکمل ذریعہ مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حواس کے ذریعے دنیا سے لینے اور دینے کا عمل کرتے رہتے ہیں۔ صرف فاعل اور شے کے درمیان کے تعلق یا عمل سے ہم شے کے بارے میں علم حاصل نہیں کر سکتے بلکہ اس شے کی خصوصیات سے ہم اس وقت واقف ہوتے ہیں جب ہم اس شے کے ساتھ عملاً تجربہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تجربہ بذات خود بنیادی طور پر علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اولاً یہ عمل کرنا ہے۔ کام کرنا ہے اور اس کے ساتھ بسر کرنا ہے۔ اس طرح سے ہم کام کرنے کے اتفاق کے نتیجے میں علم حاصل کرتے ہیں۔ فلسفۂ عملیت کے نزدیک علم حقائق کے جمع کرنے کا نام نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو فطرت کا راست مشاہدہ کرنا چاہیے۔ بیکن کے مطابق "حقائق جیسے کہ وہ ہیں ان کا مشاہدہ کرنا حقائق کو جمع کرنا اور اس بنیاد کو پانا جس پر ہم نتائج اخذ کر سکیں علم کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ حقائق کائنات سے ہم آہنگ ہونے چاہیے۔

☆ تجرباتی طریقۂ کار:۔ اس سے ان کی مراد انسان کا ہمیشہ اپنے تجربات سے گذر کر باہوش و حواس نتائج اخذ کرنا ہے۔ اس میں وہ سابقہ صدیوں سے چلے آرہے انسانی تجربات کے نتائج کو شامل کرتے ہیں۔

جب تجربہ کامیابی سے اطمینان بخش رخ پر جارہا ہو تو اس سے ہمیں ذیل کے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(1) زندگی ہر وقت رواں دواں رہتی ہے۔ زندگی پر کبھی جمود طاری نہیں ہوتا۔ بعض وقت یہ سفر آسان ہوتا ہے اور بعض اوقات ہمیں رکاوٹوں/مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ہم کچھ نیا یا الگ کرتے ہیں۔

(2) زندگی کی یہ رکاوٹیں اور مشکلات کتنی ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں وہ ہمارے لیے بہت اہم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی وجہ سے ہمیں نئے رخ (direction) ملتے ہیں جو سابقہ تجربات سے حاصل نہیں ہو سکے تھے۔

(3) مشکلات سے افراد کو حقائق پر نظر ثانی کرنے کا نادر موقع ہاتھ آتا ہے۔ وہ حقائق یا نتائج جو سابق میں انہوں نے حاصل کیے تھے۔ اس طرح زندگی حتمی نہیں بلکہ اپنی روش کو بدل کر نئے سرے سے متحرک ہوتی ہے۔

(4) یہ نئی روش کی سوچ ہمیں معلومات (Data) کا نئے حالات میں جائزہ لینے، مزید تجربات اور مزید معلومات حاصل کرنے پر اکساتی ہے۔ جن کے ذریعے مسئلے کے حل کے لیے ہم کچھ مفروضات (hypotheses) پر کام کر کے صحیح نتیجے تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(5) اس طرح حاصل ہونے والے مفروضات کی جانچ ہماری منزل ہوتی ہے۔ اس طرح ہم کامیابی سے تجربے کو مکمل کرتے ہیں۔

فلسفۂ عملیت اور علم الاقدار (Axiology of Pragmatism)

اخلاقیات کے بارے میں فلسفۂ عملیت کے خیالات کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

☆ اقدار (Values) کا قطعی اور حتمی وجود نہیں ہوتا ہے۔

☆ اقدار کا وجود، فرد کے سماجی اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔

☆ اقدار کی معنویت صرف اس وقت ہوتی ہے جب تک وہ فرد اور سماج کے لیے کارآمد ہوتی ہیں۔

☆ جب انسان اپنے آپ کوایک موثر عامل (agent) تسلیم کر لیتا ہے تب وہ اس بات کو بھی جان لیتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے اور اسے اپنی ذمہ داری قبول کرنی ہوتی ہے۔اس پس منظر میں اقدار وجود میں آتی ہیں۔

☆ عملیت میں اقدار بہت زیادہ معروضی وتنقیدی اور کم سے کم ذاتی ہوتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اقدار کا تنقیدی جائزہ لے کر ان میں سے عقلمندانہ انتخاب کرنا چاہیے۔

☆ فلسفہ عملیت کے ماننے والے انسان کی نیت وارادے کے درست ہونے اور اس کے عمل کا طے شدہ اصولوں کے مطابق ہونے کو اہمیت دیتے ہیں۔

☆ جان ڈیوی نے اس حالت کو حاصل کرنے کے لیے کہا کہ ہمیں ہر موقع کو ایک نئے موقع یا صورتحال سمجھ کر نیت وارادے کو قطعی نہ مانتے ہوئے اسے صرف مفید نتائج کے حصول کے آلے کے طور پر ماننا چاہیے۔ان کے نزدیک ہمارے اعمال کے نتائج جو ارادے کی وجہ سے وجود میں آئیں ان کی اصل اہمیت ہے۔

☆ فلسفۂ عملیت سماج کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔وہ سماج کو صرف افراد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک اساسی عمل مانتے ہیں جس پر فرد کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔یہ انحصاریت ان کے لیے بنیادی قدر ہے اور اسی جڑ سے دیگر اقدار کی نشونما ہوتی ہے۔سماج کو چاہیے کہ وہ فرد کو مختلف میدانوں میں اتنی کارگزاری کا موقع دے،جس کے ذریعے وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کر سکے اور اپنی ذات کے علاوہ سماج کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہو سکے۔

☆ سماجی زندگی میں سیاسی نظریے کے طور پر جمہوریت ایک بہترین طرز عمل ہے۔اسی نظریے کے تحت فرد کو ایک سماج کا حصہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ انفرادی طور پر سماجی زندگی میں حصہ لیتا ہے۔

فلسفۂ عملیت اور تعلیم: (Pragmatism and Education)

فلسفۂ عملیت' اس وقت نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کے اکثر ممالک کا فلسفۂ تعلیم بنا ہوا ہے۔اس فلسفے نے تعلیم کو سماجی زندگی میں مرکزی مقام عطا کیا۔اس سلسلے میں جان ڈیوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

(الف) تعلیم ایک سماجی ادارہ:

دیگر روایتی فلسفوں کے مقابلے میں فلسفۂ عملیت نے تعلیم کے ایک سماجی سرگرمی ہونے کے تصور کو پوری شدت سے پیش کیا۔جان ڈیوی کے مطابق تعلیم اس وقت تک کچھ نہیں ہے جب تک ہم اسے ایک سماجی ادارے کے طور پر قبول نہ کریں۔یہ کہتے ہیں کہ سماج کو ایک ایسے ادارے کی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے جس کا کام خالصتاً تعلیم وتعلّم کے عمل کو آگے بڑھانا ہے۔تعلیم کے رسمی اداروں میں تعلیم بجائے خود غیر رسمی ہونی چاہیے۔تعلیم کا سماج سے گہرا ربط ہو اور وہ سماج کی نشاۃ ثانیہ کا کام انجام دے۔

(ب) اسکول کی ضرورت:

(1) ہم اپنی نسلوں کو صرف غیر رسمی تعلیم اور اتفاقی تجربات/ اکتسابی عمل جو وہ روزمرہ کی سماجی زندگی سے حاصل کرتے ہیں' کے بھروسے پر نہیں چھوڑ سکتے۔

(2) موجودہ دور کی پیچیدگیاں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ہم صرف ان تجربات پر منحصر نہ رہیں جو ہمیں آسانی سے حاصل ہو جائیں بلکہ ہمیں وقت اور فاصلوں کی پرواہ کیے بغیر ضروری تجربات حاصل کرنے چاہیے۔

(3) اسکول، ماضی کے تجربات کو حال میں مفید بنا کر پیش کرتا ہے اور ہمارے ماضی کا یہ تہذیبی سرمایہ تحریری شکل میں محفوظ ہے۔ لہٰذا طالب علم کو زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیے تاکہ وہ اس سرمایے سے فائدہ اٹھا سکے۔

ان بنیادوں پر فلسفہ عملیت اسکول کو سماج کی ایک ناگزیر ضرورت قرار دیتا ہے اور یہ بھی ضروری مانتا ہے کہ اسکول کو سماج سے قریبی تعلق رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کر سکے۔

(4) اسکول، ادارے کی ایک سادہ شکل ہے۔ جب کہ سماج ایک پیچیدہ نظام ہے۔ اسکول سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسکول کو وہ ''خورد سماج'' "Miniature of Society" کہتے ہیں۔ عملیت پسند اسکول کو سماجی برائیوں سے بچانے کے لیے اس اختیار کی آزادی دیتے ہیں تاکہ وہ پسندیدہ تجربات ہی طلبا کو دے۔

(5) عملیت پسند چاہتے ہیں کہ اسکول، طلبا کو سماج سے متعلق متوازن تجربات دے۔ اسکول کو کسی بھی طرح اور کبھی بھی کسی مخصوص گروہ کو دوسروں پر فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ اسکول کبھی بھی تنگ نظر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ علاقہ واریت اور مخصوص یا محدود تہذیبی تجربات کو فروغ دے گا۔ اسکول کو طلبا میں ذات پات اونچ نیچ اور مادی لحاظ سے طبقاتی کشمکش سے دور رکھنا چاہیے۔

فلسفہ عملیت اور مقاصد تعلیم (Pragmatism & Aims of Education):

عملیت پسند تعلیم کے کسی متعین پہلے سے طے شدہ اور قطعی و آخری اور عمومی مقاصد کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک چوں کہ انسانی زندگی کے مقاصد خود زماں و مکاں کے تحت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس لیے وہ تعلیم کے پہلے سے طے شدہ مقاصد کے قائل نہیں ہوتے۔ روسو (Rousseau) کہتا ہے کہ ''چوں کہ ہماری زندگی خود تجرباتی ہے، اس لیے ہم طالب علم کو کسی متعینہ مقصد کی طرف نہیں لے جاسکتے''۔ تعلیمی مقاصد ہر طالب علم کے لحاظ سے اور وقت و حالات کے تحت تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جان ڈیوی کا کہنا ہے کہ ''تعلیم کا بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔ تعلیم کا تصور ایک مجرد یا خیالی (abstract) تصور ہے۔ مقاصد افراد کے ہوتے ہیں اور افراد کے مقاصد لازمی طور پر مختلف ہوتے ہیں متعینہ مقاصد جن کو ہم بیان کرتے ہیں وہ طلبا کو فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث بنتے ہیں تاکہ ہم انہیں صرف سفارشی نوعیت کا سمجھیں۔

(1) ایک متحرک ذہن کی تربیت جو حالات کے مطابق ڈھل سکے:۔

عملیت پسند چاہتے ہیں کہ بچے کو ایک متحرک رخ اور رہنمائی دی جائے تاکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں، رجحانات اور دلچسپیوں کے تحت اپنی ذات کا ارتقا کرے۔ وہ اس طرح بچے کو اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ وہ زندگی کے تبدیل ہوتے حالات اور مسائل سے کامیابی سے نبرد آزما ہو سکے اور ایک کامیاب زندگی گذار سکے۔

تعلیم کے ذریعے نئے اقدار کی تخلیق:

عملیت پسند ''تعلیم برائے تعلیم'' کے قائل نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم نئی نئی قدروں کے پیدا کرنے میں معاون ہو۔ وہ تعلیم کی عملی افادیت پر زور دیتے ہوئے چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے طالب علم اپنی حیاتی اور سماجی ضرورتیں پوری کرے۔ عملیت پسند طالب علم کا ہمہ جہتی ارتقا یعنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور سماجی ترقی چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم کو قدروں کے لیے حاصل نہ کیا جائے بلکہ اسے طالب علم کی خواہشات کو اس کے ماحول کے مطابق پورا کرنے میں مددگار رہنا چاہیے۔

(2) تجربات کی تعمیر نو کے لیے تعلیم:

تعلیم، عملیت پسندوں کے نزدیک صرف کتابی تعلیم نہیں ہے اس سے آگے بڑھ کر وہ اسے ترقی اور تعمیر مانتے ہیں۔علم جامد یا پہلے سے طے شدہ نہیں ہوسکتا۔علم وقت اور مقام کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔اس لیے وہ علم مسیحا ہے جو تجربے اور تجربات سے حاصل ہو۔ایک تجربہ دوسرے کا اور دوسرا تیسرے کی بنیاد بنتا ہے۔اس طرح طالب علم کے علم کے خزانے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور طالب علم ان تجربات کی روشنی میں اپنے رویے میں تبدیلی لاتا ہے۔اس طرح تجربات کی تعمیر نو جاری رہتی ہے۔

فلسفہ عملیت اور نصاب (Pragmatism and Curriculum)

عملیت پسندوں نے تعلیم و تعلّم کے عمل میں طلبا پر بالغوں کے اثرات ڈالنے یا بالغوں کی طرف سے انہیں ''کچھ دینے'' کے تصور کو سختی سے رد کیا اور تعلیم کے عمل میں بڑوں کی مرکزیت ختم کی۔

عملیت پسندوں نے تعلیم کے عمل میں طالب علم کو مرکزی حیثیت دی۔اس روایتی نظام میں طالب علم کا نصاب اور درسیات کا تعین اس کی دلچسپیوں رجحانات اور ضرورتوں کو نظر انداز کر کے چند پڑھے لکھے بالغوں (Logical minded adults) کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس طرح طالب علم اس نصاب کا اسیر بن جاتا ہے۔اس طرح کی درسیات طالب علم کو ایک چھوٹا انسان یا ایک ناپختہ بالغ تصور کرتی ہیں اور اسے اپنے بڑوں کے ذریعے جمع کردہ علم کو سیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

فلسفہ عملیت کے سب سے بڑے مبلغ جان ڈیوی نے اس روایتی طرز کی درسیات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔انھوں نے کہا کہ تعلیم طالب علم میں موجود چھپی ہوئی صلاحیتوں کو شناخت اور ان کی ترقی کا نام ہے۔اس طرح اب تعلیم ''طالب علم مرکوز'' ہوگی۔بقول ڈیوی ''طالب علم ہی ابتدا، مرکزی کردار اور اختتام ہے''۔جان ڈیوی کہتے ہیں کہ تعلیم ایک متحرک عمل ہے۔ان کے نزدیک اکتسابی عمل میں تجربات کی غیر معمولی اہمیت ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ طلبا اپنے تجربات کی بنیاد پر نئے نئے تجربات کرتے چلے جائیں۔تجربے سے مراد ان کے یہاں ''انسان کا اپنے ماحول سے تعامل (interaction) ہے''۔جب انسان اپنے ماحول کو کسی شے سے تعامل کرتا ہے تو اسے اس عمل کے کچھ نتائج حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح اکتساب کا عمل جاری رہتا ہے۔اس لیے وہ درسیات میں ایسا ماحول اور محرکات رکھتے ہیں جو طالب علم کو زیادہ سے زیادہ تجربات پر ابھارے جس طرح ایک مسافر نقشے کے ذریعے اپنے سفر کو آسان بناتا ہے یعنی سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح عملیت پسند چاہتے ہیں کہ طالب علم بھی سابقہ علم اور تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس نئی بلندیوں کو حاصل کرے۔

فلسفہ عملیت اور طریقۂ تعلیم (Pragmatic Methods of Teaching)

عملیت پسندوں کا طریقۂ تعلیم طالب علم مرکوز ہوتا ہے۔وہ کتاب معلم اور مضمون کے مقابلے میں طالب علم کی سرگرمیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اکتساب سرگرمی اور حرکت سے حاصل ہوتا ہے۔وہ معلم سے چاہتے ہیں کہ وہ طلبا کی سرگرمیوں کو اکتسابی عمل میں ایک رخ دے۔

تعلیم کا مرکز طالب علم اور اکتساب کا مرکز سرگرمی ہے۔طالب علم خود سے معلومات/علم حاصل کرے بجائے اس کے کہ ہم اس پر معلومات/علم کی بارش کریں۔ہمیں چاہیے کہ ہم طلبا کو زندگی کے حقائق کو جاننے اور معلوم کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کریں۔طریقۂ تعلیم تجرباتی ہو۔ڈیوی آگے کہتے ہیں کہ معلم وہ طریقۂ تعلیم اختیار کرے جس کے ذریعے طلبا میں غور وفکر اور تنقیدی رجحان پروان چڑھے۔ان کے اندر سوال کرنے، وجوہات جاننے کی جرات پیدا کرنی چاہیے۔معلم کو نفس مضمون کے مطابق طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔پروجیکٹ طریقہ (Project

(method) عملیت پسندوں کا پسندیدہ طریقۂ تعلیم ہے۔ یہ نتیجہ ہے ''اکتساب بذریعۂ عمل'' (Learning by doing) کے اصول کا۔ دوسرا اصول جس پر یہ حضرات زور دیتے ہیں وہ ہے۔

''اکتساب بذریعۂ زندگی'' (Learning by living) اس سے مراد یہ کہ وہ پروجیکٹ ہے جو طالب علم اپنی عملی زندگی سے متعلق مسائل کے حل کے لیے روبہ عمل لاتا ہے۔

فلسفۂ عملیت اور طالب علم (Pragmatism & Student)

طالب علم ایک زندہ اور متحرک وجود ہے وہ فطرتاً تعمیر پسند ہوتا ہے۔ طالب علم، تعلیمی عمل میں صرف غیر متحرک سننے والے کا کردار نہیں ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ طلبا کی سرگرمیوں کو سیکھنے کے عمل میں مدد و معاون بنائے۔ طالب علم کا ایک سماجی وجود بھی ہے۔ اس طرح تعلیمی عمل تین ستونی (PolarTri) ہوجاتا ہے۔ طالب علم، معلم اور سماج۔ اس لیے تعلیمی عمل کے دوران ہمیں طالب علم کو سماجی زندگی، رسوم ورواج، ضوابط، اقدار اور رویوں کی تعلیم دینا چاہیے۔ ہر طالب علم ایک منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس لیے ان انفرادی اختلافات کا احترام کرنا چاہیے۔ ہر فرد ایک ''موثر عامل'' (Agency) ہے۔ لہٰذا فرد کو اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کیوں کہ اسے اختیار کی آزادی حاصل ہے۔

فلسفۂ عملیت اور معلم: (Pragmatism & Teacher)

گو تعلیم کا مرکز توجہ طالب علم ہے۔ اس کے باوجود معلم کی حیثیت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ عملیت پسند، معلم کو ایک بہت ہی ذمہ دارانہ حیثیت دیتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری طلبا کو زندگی کی پیچیدہ راہوں پر کامیابی سے گذرنے کی راہ نمائی کرنا ہے۔ معلم سے یہ توقع ہے کہ وہ اکتسابی ماحول پیدا کرے گا، ضروری وسائل مہیا کرے گا، ضروری تجربات اور سرگرمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے طلبا کو سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ معلم طلبا کے لیے ایک دوست، فلسفی اور راہ نما ہے۔ اس کو چاہیے کہ وہ طلبا کو جمہوری طرز حیات کا عادی بنائے۔ طلبا کی ذہنی، سماجی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ جان ڈیوی نے اساتذہ کو درسیات اور نصاب کے طے کرنے میں آزادی دی، اسکول کے انتظام میں بھی آزادی دی۔ اس اہتمام کے ساتھ کہ وہ (معلم) طلبا پر خواہشات کو لادنے سے پرہیز کرے گا۔

3.4.4 فلسفۂ وجودیت (Existentialism)

اب تک آپ مغربی فلسفۂ تعلیم کے تحت فلسفۂ تصوریت، فلسفۂ فطرت پسندی اور فلسفۂ عملیت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اب اس اکائی میں آپ فلسفۂ وجودیت (Existentialism) کا مطالعہ کریں گے۔ موجودہ دور میں فلسفۂ وجودیت نے تعلیم پر قابل لحاظ اثرات ڈالے ہیں۔ اس لیے اس کا مطالعہ ہمارے لیے ضروری ہوجاتا ہے۔ یہ فلسفہ دراصل ایک فکری نظریہ ہے جو انسانی وجود پر زور دیتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق انسان ایک آزاد و فرد کی حیثیت سے جینے کا حق رکھتا ہے۔ فلسفہ وجودیت انسان کو اپنی شخصیت کی آزادانہ تعمیر کا اہل اور حق دار سمجھتا ہے یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ فلسفۂ وجودیت مکمل فلسفہ تعلیم کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتا مگر اس کے باوجود ہم اس کے تعلیم پر اثرات کو نظر انداز نہیں کرسکتے اور فلسفہ تعلیم کے اساتذہ اور طلبا اس سے صرف نظر نہیں کرسکتے۔ موجودہ دور میں اس فلسفے کے تعلیم پر واقع ہونے والے ہمہ گیر اثرات کا مطالعہ کرنا ہماری ضرورت بن گیا ہے۔

فلسفوں کی تاریخ میں فلسفہ وجودیت قدرے جدید دور رکھتا ہے۔ فلسفہ وجودیت کی اہمیت کو بیسویں صدی میں تسلیم کیا گیا اور اسی

صدی میں اس کو فروغ حاصل ہوا۔اس فلسفے کی ترویج میں اہم نام سورین کریکگارڈ Soren Kierkegard کا آتا ہے۔اسے اس فلسفے کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔اس فلسفے کے فروغ میں ایڈمنڈ ہسرل (Edmund Husserl)(1859-1938) کے شاگرد مارٹن ہیڈگر Martin Heidegger کا بہت بڑا کردار ہے۔اس کے علاوہ جین پال سارترے Jean Paul Sartre نے بھی فلسفہ وجودیت کو سنوارنے میں خاصا کام کیا ہے۔

تاریخی طور پر فلسفہ وجودیت کی جڑیں ہمیں دو عالمی جنگوں میں ملتی ہیں۔ان دونوں عالمی جنگوں نے انسانی جان اور مال کی جو تباہی مچائی وہ عدیم المثال ہے۔اس کے نتیجے میں مصنفین نے ایسی کہانیاں، ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے جس میں موت، مصائب، بے چینی، غصہ، تباہی، بربادی جیسے مضامین کے ساتھ ان جنگوں میں لاکھوں انسانوں کی جانی قربانیوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔ان مخصوص حالات نے انسانوں کو اپنی حالت اور حقیقت پر ایک نئے سرے سے غور وفکر کرنے کی دعوت دی کیوں کہ عموماً عام حالات میں جب کہ ہم خوش اور شاد کام ہوں ہم اپنی حقیقت کو کم ہی تلاش کرتے ہیں۔اس طرح کی تحریروں نے عالمی پیمانے پر اپنے اثرات ڈالے۔اسی طرح اس وقت مختلف ممالک کے فلاسفر بھی اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے سابقہ فلسفوں کے خلاف آواز بلند کی۔گویا اسے ہم روایتی فلسفوں کے خلاف بغاوت قرار دے سکتے ہیں۔

چوں کہ یہ وجودیت کے حامی فلاسفر روایتی فلسفوں کے نظام اور رویے سے نالاں ہیں اس لیے یہ معروف معانی میں وجودیت کو ایک فلسفہ نہیں کہتے۔اس لیے ہم اس فلسفے کا مطالعہ روایتی نداز سے نہیں کر سکتے۔اس کے لیے ہمیں اس طرز فکر کے اہم تصورات کو سمجھنا ہوگا۔

فلسفۂ وجودیت کے اہم تصورات:

(1) **فلسفہ زندگی کی حقیقت:** وجودیت کے حامی فلاسفر 'فلسفہ' کو نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔روایتی فلسفوں کی طرح ان کے نزدیک فلسفہ صرف حقیقت کو جاننے یا معلوم کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ سچائی کو وجود میں لایا جائے ان کے نزدیک زندگی کوئی معمہ نہیں ہے جسے ہمیں صرف حل کرنا ہے بلکہ زندگی کی حقیقت کا ہمیں تجربہ حاصل کرنا چاہیے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہر انسان کو اپنے تجربات کی حقیقت کی روشنی میں خود اپنا فلسفہ زندگی طے کرنا چاہیے۔انسان کو اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے زندگی کے عملی مسائل سے نبرد آزما ہو کر اس حقیقت کی تلاش کرنی چاہیے جو ''موجود'' ہے۔

(2) **فلسفہ بحران:** وجودیت کو فلسفہ بحران (Philosophy of Crises) بھی کہا گیا ہے کیوں کہ فلاسفر یہ بات پیش کرتے ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ جب بحرانی حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے اپنی حقیقت کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہی موقع فلسفہ زندگی کے طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(3) **جوہر اصلی یعنی روح پہلے یا وجود پہلے:**(Essence first or Existance first) فلسفہ وجودیت کا یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ان کے نزدیک ''وجود پہلے ہے اور جوہر اصلی یعنی روح بعد میں'' جب کہ سابقہ فلاسفر اس کے برعکس جوہر اصلی کو اول مانتے ہیں اور اس کی تلاش کرتے ہیں۔سارترے کے مطابق انسان پہلے وجود میں آتا ہے، پھر منظرنامے پر ظاہر ہوتا ہے اور بعد میں وہ اپنے آپ کو جانتا ہے۔اس فلسفے کے مطابق انسان کی تعریف بڑی پیچیدہ ہے کیوں کہ انسان صرف وہی نہیں ہے جو وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے بلکہ انسان وہ بھی ہے جو وہ اپنے آپ کو بنانا چاہتا ہے۔انسان اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے آپ کو بناتا ہے یعنی حقیقتاً وجود میں لاتا ہے۔

(4) **وجود کی حقیقت:** انسانی وجود کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی پیدائش سے لے کر موت کے درمیان کا عرصہ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ پیدائش سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور موت کے بعد بھی کچھ نہیں رہے گا۔ پیدائش سے موت تک کے عرصے میں ہم سماجی زندگی کے اتفاقی حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں بحرانی کیفیت، خوف و دہشت، غیر یقینی حالات سے دوچار ہو کر انسان آخر کار موت سے ہم کنار ہو کر اس سے نجات پاتا ہے۔ اس ضمن میں بطور خلاصہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسان کو کسی نہ کسی دن مرنا ہے۔ موت کی یہ اٹل حقیقت مستقبل کے بارے میں انسان کے امکانات کی دنیا کو محدود کر دیتی ہے۔ مستقبل محدود ہونے کے ساتھ متعین بھی ہے۔ انسان اس بات کو جانتا ہے اور یہی اس کی دنیا میں حقیقت ہے۔ انسانی وجود مختصر ہے اور یہ کسی بھی لمحے ختم ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت کی وجہ سے انسان ایک ہیجان انگیز اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طرح وہ خوف اور دہشت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فلاسفہ 'انسان کن حالات' میں جی رہا ہے اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

(5) **اقدار:** فلسفہ وجودیت کے قائلین کسی بھی طرح کی آفاقی قدروں کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ہر فرد یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اپنی اقدار خود وضع کرے۔ ہر فرد اپنے طرز زندگی کا خود انتخاب کرے تاکہ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گذار سکے۔ ان کے نزدیک حقیقت ظہور پذیر حالت میں ہے۔

(6) **انسان کی حقیقت:** فلسفہ وجودیت کا کہنا ہے کہ انسان کا کوئی خالق (پیدا کرنے والا) نہیں ہے۔ انسان وجود پاتا ہے۔ منظرنامے پر ظاہر ہوتا ہے اور بعد میں اپنا تعارف حاصل کرتا ہے۔ اس کا وجود پہلے ہوتا ہے اور بعد میں وہ اپنے جوہر اصلی (Essence) معلوم کرتا ہے۔ اس فلسفے کی نظر میں انسان آزاد اور ذمہ دارانہ وجود رکھتا ہے جو اپنے وجود کی تکمیل کے لیے پرعزم ہوتا ہے۔ انسان کوئی بے یارومددگار اور طفیلی وجود نہیں ہے جو اسے کیا دیا گیا ہے یہ تلاش کرتا رہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں ہم کوئی آفاقی نظریہ قائم نہیں کر سکتے کیوں کہ انسان اس کے فہم سے معذور ہے۔ یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ انسانی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال میں انتخاب کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہے اور اسے اپنے انتخاب کی آزادی کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔

(7) **اضطراب انگیز ہیجان (Anxiety):** فلسفہ وجودیت میں اس تصور کی بڑی اہمیت ہے۔ آئیے اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اضطراب انگیز ہیجان (Anxiety) کا مطلب صرف غیر یقینی حالات اور اس کے نتائج کے بارے میں فکرمند ہونا نہیں ہے۔ یہ اصطلاح ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے۔ اس کے مطابق انسان اپنی ذات کی تکمیل کے مراحل سے گزرتا رہتا ہے اس درمیان اسے ان ناگہانی حالات کا ادراک ہوتا ہے جو اس کے وجود کے لیے خطرہ ہوتے ہیں۔ اگر میری تشویش کسی مخصوص شے یا واقعے سے متعلق نہ ہو تو میرے وجود کے لیے امکان موجود ہوتا ہے۔ ایسا وجود جو ہر طرح کے اقدار اور معیار اور میری ذات کے معانی سے خالی ہو۔ اس تصور میں کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے نفس کو تنہا کر لیتا ہے اور تمام اشیا، واقعات اور افراد سے اپنے تعلق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ گو انسان ایک آزادانہ وجود رکھتا ہے مگر وہ دنیاوی بندشوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے جس پر اس کا کوئی قابو نہیں ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو ایک اجنبی اور دشمن سمندر میں پھینک دیا گیا ہے۔ اس طرح انسان کی اپنے وجود کے مالک ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً انسان دکھوں اور غموں سے راہ فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے تحریک حاصل کر کے انسان اپنے ڈر اور خوف کو دور کرنے کے لیے اجتماعی طور پر روایتوں کے لگے بندھے طریقے پر عمل کرنے لگتا ہے۔

(8) موت اور فنا: اس تصور کے تحت فلسفہ وجودیت کے خیالات اختصار کے ساتھ ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔

☆ موت سے گزر کر انسان فنا سے ہمکنار ہوتا ہے۔

☆ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی موت کو بالکل ذاتی انداز میں لے مثلاً کسی عزیز/ دوست کی موت کا سنتے ہیں۔اس کے جنازے میں بھی شریک ہوتے ہیں مگر ہم اپنی موت کو یاد نہیں کرتے۔ہم اسی موت کے تصور سے بھاگتے ہیں جب کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔

☆ انسان کو اپنی موت کو ایک ناگہانی حقیقت کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ہمیں اپنے ''وجود'' کے ثبوت کے لیے اس کے خاتمے یعنی موت کی ضرورت ہوتی ہے۔ہم موت کے تصور سے بھاگ کر اپنے وجود کو مکمل طور پر نہیں منوا سکتے۔ہمیں موت کو اپنے وجود کی ایک مرکزی شے تسلیم کرنا چاہیے۔

☆ ہمیں موت کو ایک ناگزیر حادثہ سمجھنا ہوگا جو ہماری زندگی یعنی وجود کی سرحد ہے جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح زندگی اور موت بھی دونا قابل تفریق رخ ہیں۔

☆ وجودیت کے حاملین کہتے ہیں کہ ہمیں موت کو پوری اہمیت دینی چاہیے کیوں کہ ہم زندگی کے جو دن گذارتے ہیں وہ ہمیں موت کے عمل سے قریب تر کرتے رہتے ہیں۔یعنی ہم مرنے کے لیے جی رہے ہوتے ہیں۔ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہوگا کیوں کہ یہ کبھی بھی آسکتی ہے۔ان کا فنا ہونا ہمارے وجود پر چھائی ہوئی حقیقت ہے۔یہ ہمیں حیران بھی کرتی ہے اور دکھ بھی دیتی ہے انسان چاہے جتنے عیش و آرام میں زندگی گذارے مگر آخر وہ فنا ہونے والا ہے۔

فلسفہ وجودیت اور تعلیم:

وجودیت نے تعلیم میں کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔دیگر تعلیمی فلسفوں کی طرح وجودیت کے تعلیمی فلسفے کی تشریح نہیں کی گئی۔اس کے باوجود ہم وجودیت کے فلسفے کی تعلیم پر واقع ہونے والے اثرات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ذیل میں ایسے ہی چند پہلوؤں پر گفتگو ہوگی۔

☆ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ وجودیت کے حامل فلاسفر نے ان کے تعلیمی فلسفے کی کوئی توضیح نہیں کی ہے۔ہمیں تعلیمی فلسفے کے جوابات ان کے فلسفے سے اخذ کرنے ہوں گے۔

☆ تعلیم کا مفہوم:۔فلسفہ وجودیت میں تعلیم کا مفہوم متعین کرنے میں ہمیں کافی مشکل ہوتی ہے کیوں کہ اس فلسفے کے مقلدین نے اس نکتہ پر راست کوئی بات نہیں کی۔البتہ بعض افراد نے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر تعلیم کی تعریف کی کوشش کی۔اس فلسفے کا جائزہ لے کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک تعلیم کا مفہوم ''فرد کا اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کا ادراک کرنا ہے''۔تعلیم کو فرد میں مربوط واقعیت' اتفاقی حوادثات' ناگہانی حالات اور ان واقعات کو سمجھنے میں مدد دے جو ہمارے حال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تعلیم انسان کے اندر اس کے وجود کو لاحق خوف، دہشت، فکر اور تشویش کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرے تا کہ وہ موت کا خوشی خوشی استقبال کر سکے۔یہ فلاسفر کہتے ہیں کہ انسانی زندگی ایک بڑے خطرے سے دوچار ہوتی ہے اور وہ خطرہ ہے زندگی کی طرف دعوت دینا یا تباہی کے لیے لبھانا۔

تعلیم برائے خوشی و مسرت (Pleasure) کو وہ خطرناک تصور کرتے ہیں۔ہم بغیر دکھ اور درد (Pain) کے خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔ان کا کہنا ہے تعلیم کے ذریعے ایک بالغ فرد اپنی وجود کی (زندگی) کے آزمائشوں دکھ، مصائب اور آزمائشوں سے نبرد آزما ہونا سیکھے۔

مقاصد تعلیم:

فلسفہ وجودیت چوں کہ انفرادیت پر غیر معمولی زور دیتا ہے اس لیے ان کے نزدیک تعلیم کا پہلا زینہ خود شناسی ہے تعلیم کا اہم کردار زندگی (وجود) کے ساتھ احسن انداز میں غور وفکر کرنا ہے۔ طلبا کو زندگی کے تمام پہلوؤں کو جاننا ضروری ہے۔ حال کے تجربات ماضی کی روشنی میں انجام دیے جاتے ہیں اور مستقبل کا اندازہ حال سے لگایا جاتا ہے۔ اس لیے طالب علم کو زندگی کے معانی جاننے کی خود کوشش کرنا چاہیے جو اس میں ناکام ہو جائے یا مستقبل کے امکانات کے انتخاب میں ناکام ہو جائے تو وہ مایوسی اور اضطراب کا شکار ہو کر اپنے وجود کی افادیت کھو دیتا ہے۔

وجودیت فرد میں جرأت (Courage) پیدا کرتی ہے۔ یہ جرأت انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) کے استعمال کے لیے ضروری ہے۔ فرد کو مخالفتوں کا حتی الامکان ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے قابل بنانا ہے۔

فلسفہ وجودیت انسان کے اندر اپنی آزادانہ حیثیت کا شعور پیدا کرنا چاہتی ہے۔ آزادی، ذمہ داری کے ساتھ، وجودیت کا اہم اصول ہے۔ اس لیے وہ فرد میں ذمہ داری کا شعور بیدار کرتے ہیں۔

طریقۂ تعلیم:

☆ وجودیت طریقۂ تعلیم کے بطور سوال جواب' کے طریقے کو ذرا اصلاح کے ساتھ اپناتے ہیں۔ وہ سوال کے جواب' جواب کی اصلاح اور مزید سوالات اور جوابات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تا کہ کسی متفقہ نتیجے تک رسائی ہو سکے۔

☆ وجودیت کے حامی سقراط کے استقرائی طریقے (Inductive Method) کی بھی وکالت کرتے ہیں۔

☆ وجودیت کے حاملین طلبا کی انفرادیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس لیے انفرادی توجہ ان کے لیے ایک ضروری امر ہے۔ وہ اسکول میں تعلیم کے بجائے اسی انفرادیت کے پیش نظر گھر پر تعلیم کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک طلبا سے ذاتی تعلق اہم تر ہے بہ نسبت نظام الاوقات کے۔

☆ وجودیت کے حاملین چاہتے ہیں کہ معلم کو طلبا پر اپنے خیالات، عقائد اور اقدار کو ٹھونسنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

☆ ان کے نزدیک طلبا میں تخلیقیت (Creativity) پیدا کرنے والے طریقے استعمال کرنا چاہیے۔

نصاب تعلیم:

درج بالا مقاصد کے حصول کے لیے وجودیت پرست ایک آزاد نصاب کی سفارش کرتے ہیں۔ اس سے مراد ان کا اذہان کو شک و تردد اور جہالت سے آزادی دلانا ہے۔ وہ طالب علم کے لیے مخصوص نصاب تجویز نہیں کرتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ طالب علم خود اپنی ضرورت اور اہلیت کے مطابق نصاب کے انتخاب میں آزاد ہو۔ ان کے نزدیک طالب علم کا اپنی زندگی میں درپیش سیاسی، سماجی، معاشی و عمرانی (وجود) مسائل سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ہارپر (Harper)، پڑھنے، لکھنے، ریاضی کے اعمال اور تاریخ کے مطالعے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ منطق کے مطالعے کو حقیقت کی تلاش کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

سارکرے اور ہیڈگر (Sarcre & Hedgar) کے نزدیک سماجی علوم کو سائنسی علوم پر فوقیت حاصل ہے۔

ان کے نزدیک کائناتی علم سے زیادہ اہم انسان کی خود شناسی ہے۔ اس لیے وہ نصاب میں خود شناسی کے لیے اہتمام کرتے ہیں۔

فلسفہ وجودیت اور معلم:

- ☆ معلم کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنے وجود کو منوائے۔ اسے اپنی اقدار کو طے کر کے ان سے چمٹے رہنا چاہیے۔ اسے اپنی ذات، خیالات، عقائد اور اقدار کو طلبا پر ٹھونسنا نہیں چاہیے۔
- ☆ معلم کو چاہیے کہ وہ طلبا کو ان کے وجود کے فہم کے لیے تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کرنے اور تجزیاتی مطالعہ کرنے پر ابھارے۔
- ☆ معلم اپنے طلبا کی آزادی اور انفرادیت کا بھرپور احترام کرے۔
- ☆ معلم کو اپنے طلبا کے جذباتی علاقوں تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔
- ☆ معلم اپنے طلبا کے حالات، ضرورت اور دلچسپیوں سے واقف رہے۔

3.5 یاد رکھنے کے نکات (Points to Remember)

سانکھیہ فلسفے میں خاص طور پر تخلیق کے سوال پر غور کیا گیا ہے۔ سانکھیہ فلسفے میں نظریاتی بحث ہے جب کہ یوگا فلسفے میں عملی پہلو اجاگر کیے گئے ہیں۔ سانکھیہ فلسفے میں دو حتمی حقیقتیں ہیں۔ پراکرتی اور پروشا۔ علت اور معلول میں صرف ہیت کا فرق ہوتا ہے۔ اثر وجہہ میں بالقوی موجود ہوتا ہے۔ تخلیق کے لیے مادّی وجہہ کا ہونا ضروری ہے۔ پراکرتی ان کے نزدیک اوّلین وجہہ ہے۔ پراکرتی ایک ہے ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی۔ اس کے حصّے نہیں کیے جاسکتے۔ پراکرتی تمام وجوہات کی وجہہ ہے۔ جو کائنات کو ایک مشترک دھاگے میں باندھے رکھتی ہے۔ تمام اشیا ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ پراکرتی کے تین گُن ہوتے ہیں، ستاوا، تمس اور رجس۔ پروشا خالص شعور کا نام ہے اور تمام علم کی بنیاد ہے۔ جہالت تمام مسائل کی جڑ بنیاد ہے۔ سانکھیہ علم کے تین ذرائع بتاتا ہے ادراک، استنباط اور شہادت۔

- ☆ یوگا فلسفہ انسان کی نجات پانے کے لیے عملی طریقوں سے واقف کراتا ہے۔
- ☆ انسانی آزادی اور نجات کے لیے علم کی ضرورت کا قائل ہے۔
- ☆ یوگا فلسفہ، سانکھیہ فلسفے کی عملی شکل ہے۔
- ☆ یوگا نجات کے حصول کے لیے ذہنی اور جسمانی خواہشات کو کنٹرول کرنے کی تلقین کرتا ہے۔
- ☆ حقیقی علم کے حاصل ہونے سے ہم اقتدار سے بے نیاز ہو سکتے ہیں اور خوشی اور غم کی غلامی/ اثرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔
- ☆ ادراک، استنباط اور مذہبی کتابوں سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔
- ☆ حواس کے ذریعے تصدیق شدہ مشاہدات ہی علم کا ذریعہ ہیں۔
- ☆ یوگا کا مقصد طاقت کا حصول نہیں ہے۔ بلکہ نجات کی حقیقت کو پانا ہے۔
- ☆ یوگا کی آٹھ اقسام ہیں۔
- ☆ یوگا میں پانچ آسن ہیں۔ آسن کے ذریعے جسمانی مضبوطی اور ذہنی صحت حاصل ہوتی ہے۔
- ☆ یوگا معلم اور طالب علم دونوں سے ذہنی جسمانی اور عقلی نظم وضبط کا مطالبہ کرتا ہے۔
- ☆ نیایہ فلسفہ نے حقیقت کی تلاش میں منطق کو بہت اہمیت دی۔

☆ نیا یہ فلسفہ انسانی زندگی میں عدم توازن کے لیے انا (Ego) کو ذمّہ دار قرار دیتا ہے۔

☆ اس فلسفے کے مطابق دُکھوں سے نجات کے لیے حقیقی علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

☆ نیا یہ علم کے چار ذرائع تسلیم کرتا ہے ادراک، استنباط، تقابل اور شہادت۔

☆ نیا یہ فلسفے میں علم کی نوعیت، علم کے ذرائع کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

☆ اس فلسفے نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ 1) پر ما یعنی حقیقی علم 2) اپر ما یعنی غیر حقیقی علم

☆ نیا یہ فلسفے میں علم کے ذرائع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

☆ استدلال کے ذریعے حاصل سچائی کا علم آفاقی ہوتا ہے۔

☆ نیا یہ فلسفہ طلبا میں تنقیدی فکر اور تعمیری سوچ پروان چڑھاتا ہے۔

☆ نیا یہ فلسفہ طلبا کو خود شناسی کے حصول میں متعلق مطالعہ غور وفکر اور قوت فیصلہ سے مدد لینے کی تلقین کرتا ہے۔

اس اکائی میں ہم نے فطریت کو جاننے کی کوشش کی۔ اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ طلبا کی طفل مرکوز تعلیم پر زور دیا جائے اور آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے۔ ہم نصابی سرگرمیوں کو بھی غیر معمولی اہمیت ساتھ ہی ساتھ Heuristic طریقہ تدریس کو اہمیت دی گئی ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ساتھ اور ایک جیسی تعلیم کی وکالت کی۔

(1) فلسفہ عملیت تعلیم کے عمل میں عملی افادیت/ استعمال کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ان کے نزدیک سچائی، خیالات اور اقدار کو ان کے عملی نتائج کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے۔

(2) عملیت پسند تعلیم کو ایک سماجی ضرورت مانتے ہیں اور جمہوری طرز کو رائج کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔

(3) کام کر کے سیکھنے پر زور دینا اس فلسفے کی ایک اہم خصوصیت ہے ان کا نصاب عملی سرگرمیوں پر منحصر ہوتا ہے۔

(4) مکمل طالب علم کی نشو ونما اس فلسفے کا مطمع نظر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طالب علم کی دماغی، جذباتی اور جسمانی تمام صلاحیتوں کا ارتقا ہو۔

(5) منصوبائی طریقہ (Project Method):۔ اس فلسفے کے حامی طریقہ تدریس میں پروجیکٹ میتھڈ کو استعمال کرتے ہیں۔

(6) فلسفہ عملیت بچوں کو مفت اور ہمہ گیر تعلیم کی فراہمی کی بات کرتے ہیں۔

(7) معلم بحیثیت مددگار، صلاح کار اور راہ نما۔

☆ فلسفہ وجودیت عمومی مذہب، عمومی سماج، عمومی تعلیم اور عمومی ابلاغ و ترسیل کے خلاف ہے۔

☆ یہ فرد کی انفرادیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

☆ حقیقت کا صرف علم کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں اسے وجود میں لانا چاہیے۔

☆ اس فلسفے کو فلسفہ بحران بھی کہتے ہیں۔

☆ ان کے نزدیک وجود، جوہر اصلی (روح) سے پہلے آتا ہے۔

☆ یہ لوگ آفاقی قدروں کی بجائے انفرادی قدروں کے قائل ہیں۔

☆ ان کے نزدیک حقیقت اب بھی ظہور پذیر ہے۔

☆ ان کے مطابق انسان کی حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے کچھ نہیں تھا اور نہ مرنے کے بعد کچھ رہے گا۔

☆ فلسفہ وجودیت خدا کا انکار کرتے ہیں۔

☆ انسان کو آزادی اس کی ذمہ داری کے ساتھ حاصل ہے۔

☆ انسان اپنی زندگی (وجود) میں ناگہانی آفات کا شکار ہوتا رہتا ہے۔

☆ ان کے نزدیک انسان کو موت کا ہنسی خوشی استقبال کرنا چاہیے۔

3.6 فرہنگ (Glossary)

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ارتکاز	Concentration	ادراک/شعور/دریافت	Perception
استنباط/استدلال/نتیجہ	Inference	غلط فہمی	Misapprehension
نفس	Self	حواس	Senses
ذہن	Intellect	سرگرمی	Activity
عدم توازن	Imbalance	نتائج	Consequence
دُکھ	Suffering	پنرجنم	Rebirth
نجات	Liberation	فلسفۂ عملیت	Pragmatism
مابعدالطبیعیات	Metaphysics	نظریۂ علم	Epistemology
علم الاقدار	Axiology	تین ستونی	Tripolar
فلسفۂ وجودیت	Existentialism	روح	Essence
وجود	Existance	اضطراب، ہیجان	Anxiety
جرأت	Courage	حتمی حقیقتیں	Ultimate realities
مکاں	Space	زماں	Time
حالت	Shape	ذات	Self
بنیادی وجہہ	Fundamental Course	نفس کی حقیقت	Nature of Self
استنباط	Inference	شہادت	testimony

3.7 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں (Unit End Activities)

معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1) تصوریت میں.................................... دنیا کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

2) تصوریت کے دائمی اقدار.. شامل ہیں۔

3) تصوریت میں.......................... اور....................................ہی اصل حقیقت ہیں۔

4) تصوریت کا بانی................................ ہے۔

(5) فلسفۂ عملیت کا سارا زور اشیا کو —— کے نتائج کے ذریعے سمجھنے کا ہے۔

(1) خدا (2) مشاہدہ (3) تجربے (4) خصوصیات

(6) فلسفۂ عملیت انسان کو دنیا میں —— طور پر آزاد سمجھتا ہے۔

(1) مکمل (2) محدود (3) کسی قدر (4) لامحدود

(7) فلسفۂ عملیت اقدار کو —— نہیں مانتا۔

(1) قطعی اور حتمی (2) مکمل (3) نا قابل تغیر (4) ادھورا

(8) فلسفۂ عملیت تعلیم کو —— کام تصور کرتا ہے۔

(1) رفاہی (2) حکومتی (3) مذہبی (4) سماجی

(9) معلم طلبا کے لیے ایک —— ہے۔

(1) دوست (2) فلسفی (3) دشمن (4) باپ

(10) وجودیت معروف معانی میں ایک —— نہیں ہے۔

(1) فلسفہ (2) علم (3) مضمون (4) کتاب

(11) وجودیت کو —— کہا گیا۔

(1) فلسفۂ خوشی (2) علم الکلام (3) فلسفۂ بحران (4) فلسفہ

(12) انسان کو اپنی موت کو ایک —— حقیقت کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔

(1) ناگہانی (2) بڑی (3) عمومی (4) مذہبی

(13) فلسفۂ وجودیت کے حامی تعلیم برائے خوشی و مسرت کو —— سمجھتے ہیں۔

(1) ناممکن (2) ممکن (3) خطرناک (4) حقیقت

(14) وجودیت فرد میں —— پیدا کرتی ہے۔

(1) بزدلی (2) جرأت (3) کم ہمتی (4) ڈر

مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1) ستاوا، رجس اور تمس کا مفہوم بیان کیجیے۔

2) سانکھیہ فلسفے میں انسانی دُکھوں اور غموں کی کیا وجوہات ہیں؟

3) سانکھیہ میں علم کے کون سے ذرائع تسلیم کیے جاتے ہیں؟

4) اشیا اور پراکرتی میں فرق بیان کیجیے۔

5) نیایہ فلسفہ نجات کے لیے کونسی چار تعلیمات دیتا ہے؟

6) نیایہ فلسفہ علم کے کون سے ذرائع تسلیم کرتا ہے؟

7) استنباط کے تین مراحل بیان کرو۔

8) پرما اور اپرما کی وضاحت کرو۔

9) استدلال کے قبول ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

10) فلسفہ عملیت کے نظریہ علم پر مختصر نوٹ لکھیے۔

11) فلسفہ عملیت کے مقاصد تعلیم پر روشنی ڈالیے۔

12) فلسفہ عملیت کے علم الاقدار پر روشنی ڈالیے۔

13) فلسفہ عملیت اور تعلیم پر نوٹ لکھیے۔

14) فلسفہ عملیت کے مقاصد تعلیم بیان کیجیے۔

15) فلسفہ وجودیت کی تاریخ پر نوٹ لکھیے۔

16) فلسفہ وجودیت کے نزدیک انسان کی حقیقت بیان کیجیے۔

17) فلسفہ وجودیت میں زندگی سے کیا مراد ہے؟

18) فلسفہ وجودیت میں موت اور فنا کے تصور کو واضح کیجیے۔

19) فلسفہ وجودیت کا کوئی مستقل فلسفہ تعلیم نہیں ہے۔ واضح کیجیے۔

20) یوگا میں علم کے ذرائع کون سے ہیں؟

21) یوگا کا نفسیاتی پہلو بیان کیجیے۔

22) یوگا فلسفے میں ستہ میں تبدیلوں کی وجوہات اور اُن کا حل تحریر کیجیے۔

23) یوگا میں ستہ سے بے نیاز ہونے کی کیا شرط بتائی گئی ہے؟

24) یوگا میں ستہ کے پانچ مراحل کون سے ہیں؟

طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1) سانکھیہ فلسفے کے نظریہ علم پر روشنی ڈالیے۔

2) پروشا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3) پرینام وادااور وی وارتاوادا کے درمیان فرق واضح کیجیے۔

4) یوگا فلسفے کے اصول (سدھ) تحریر کیجیے۔

5) ستہ پر قابو پانے کے لیے یوگا کون سے سادھن تجویز کرتا ہے۔

6) یوگا فلسفہ اور تعلیم پر اظہار خیال کیجیے۔

7) نیایہ فلسفے میں حقیقی علم کے ضمن میں کن نکات کو اہمیت حاصل ہے؟

8) نیایہ فلسفہ اور تعلیم پر مفصل اظہار خیال کیجیے۔

9) نیایہ فلسفے کے مطابق ہمیں دُکھوں سے نجات کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

10) نیایہ میں ادراک کی حقیقت بیان کرو۔

11) نیایہ میں استنباط کے مراحل بیان کرو۔

12) فلسفۂ عملیت دنیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟

13) فلسفۂ عملیت میں نصاب اور طریقۂ تدریس پر روشنی ڈالیے۔

14) فلسفۂ عملیت کے علم الاقدار کو بیان کیجیے۔

15) فلسفۂ عملیت کے منفی پہلو کون سے ہیں۔

16) فلسفہ وجودیت کے تعلیم پر اثرات لکھیں۔

17) فلسفہ وجودیت کو فلسفہ بحران کیوں کہتے ہیں۔

3.8 تجویز کردہ مواد (Suggested Readings)

1. I Donald Butler, Four philosophis & their practice in educational religion. 3rd edition. Harper & Roow publishers N.York
2. Ghanta Ramesh, Dash BN, Foundation of education Neelkamal Publications 2006 New Delhi
3. Seetharamu, AS philosophies of education. 2014, APH publishing corp. N.Delhi-110002
4. Santhosh Valikkat, Philosphosy of education. 2012, APH Publishing Corporation

New Delhi- U.S. Vashishtha, Hemant khandai and Anshu

5. Mathur, : Educational Philosophy, 2013, APH Publishing Corporation, New Delhi.

6. Deepsh Chandra Prasad Dr. : Philosophical Foundation of Education, 2008, KSK Publisher and Distributor, New Delhi.

7. Santosh Vallkkat Dr. : Philosophy of Education, 2014 APH Publishing Corporation, New Delhi.

8. J. Donald Bultler, Four Philosophier & theie practice in education & religion. 3rd edition Itarper & Row Publishers N.York

9. Ghanta Ramesh Dash B.N. Foundation of education (2006). Neel Kamal Publications. N.Delhi

10. Santosh Valikkat, Philosophy of education (2012), APH Publishing Corporation N.Delhi

11. Seether Ramu A.S. Philosophy of education (2014) APH Publishing Corporation N.Delhi

12. پروفیسر محمد طاہر القادری (2000): حقیقت تصوف جلد اول منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور

13. امام ابوالقاسم القشیری الرسالۃ التفسیرہ

14. شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ شرح الرسالۃ القشیریہ

15. امام جلال الدین سیوطیؒ جلالین

16. حضرت مخدوم علی ہجویری العروف داتا گنج بخشؒ: کشف المحجوب

17. خواجہ سیّد اشرف جہاں گیر سمنانی 1208ء : اخلاق و تصوف

18. خواجہ بندہ نواز گیسو دراز معراج العاشقین

19. ساجد جمال، عبدالرحیم: ابھرتے ہندوستانی سماج میں تعلیم (2012)، شیرا پبلیکیشن، نئی دہلی

اکائی 4 ۔ اقدار کی تعلیم

(Value Education)

اکائی کے اجزا؛

4.1 تمہید (Introduction)

4.2 مقاصد (Objectives)

4.3 اقدار کا تصور (Concept of Value)

4.4 تعلیمِ اقدار کی ضرورت (Need for Value Education)

4.5 اقدار کی درجہ بندی (Classification of Values)

4.6 اقداری بحران (Value Crisis)

4.7 اقدار کے فروغ کی طرز رسائیاں (Approaches to Inculcate Values)

4.8 اقدار اور خوشحال زندگی (Values and Harmonious Life)

4.9 یاد رکھنے کے نکات (Points to Remember)

4.10 فرہنگ (Glossary)

4.11 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں (Unit End Activities)

4.12 تجویز کردہ مواد(Suggested Readings)

4.1 تمہید (Introduction)

تعلیم ایک زیور ہے خوشحالی میں اور مصیبت میں ایک پناہ گاہ۔ تعلیم کی قدر کے ذریعے ہم سب ایک زندہ مثال کے طور پر اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کام کریں اور مستقبل میں ہماری ثقافت کی حقیقی روایت کو با اختیار بنائیں۔ اس اکائی میں آپ اقدار اور ان کی درجہ بندی، اقدار میں بحران اور کیسے ہم اپنے کھوئے ہوئے روایتی اقدار کو پھر سے واپس لا سکتے ہیں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نئی حکمت عملی اور اقدار پیدا کرنے کی تکنیک سے آپ کو آگاہ کرائیں گے۔ سب سے پہلے ہر انسان اپنی زندگی میں کچھ مقاصد کا تعین کر لیتا ہے اور ہر انسان کی زندگی کا مقصد الگ الگ ہوتا ہے۔ کچھ کو دولت چاہیے کچھ کو علم کی پیاس ہوتی ہے کچھ کو اقتدار چاہیے اور کسی کو آزادی کسی کو نام شہرت وغیرہ چاہیے کچھ کو پیار و محبت چاہیے اور کسی کو دوسروں کی خدمت کا موقع۔ اور اگر دیکھا جائے تو انسان اپنا مقصد پورا کرنے میں اپنی ساری زندگی صرف کر دیتا ہے صرف وہ مقصد جو اکثر اپنی خواہش پوری کرے نہ کہ دوسرے انسان کے لیے فائدہ مند ہو۔ اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ ایسے اقدار کو فروغ کیا جائے جو انسانیت قائم رکھنے کے لیے کام آئیں اور اقداری تعلیم ہی اس مقصد کو پورا کرنے کی خواہش پیدا کر سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں اقداری تعلیم حاصل کرنے والا انسان دوسرے انسان سے بہتر ہوگا۔ وہ جانے گا کہ انسانیت کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے اور اس کے اندر انسانیت برقرار رکھنے کی سوچ پیدا ہوگی۔

4.2 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ اقدار کے تصور کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے واسدایو کٹمبکم (Vasudaiv Kutumbakam) کے تصور کو بیان کر سکیں۔

☆ معاشرے میں مثبت مطابقت (Positive Adjustment) کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

☆ شخصیت سازی کے مظاہر (Indicators) پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ انسانی زندگی کے اہم مقصد کو بیان کرتے ہوئے اقدار پر روزمرہ زندگی میں عمل پیرا ہو سکیں۔

☆ جسم، ذہن اور روح کی ہم آہنگ ترقی کے لیے سرگرمیوں کا انتخاب اور منصوبہ بندی کر سکیں۔

☆ پروان چڑھانے کی نئی حکمت عملیوں اور تکنیکوں پر اظہارِ خیال کر سکیں۔

4.3 اقدار کا تصور (Concept of Values)

لفظ قدر (value) کی ابتدا Latin زبان کے لفظ Valerei سے ہوئی ہے جس کا مطلب ہے اہمیت (Importance)۔ عام طور پر سماج جن معیارات (Standards) کو اہمیت دیتا ہے اور جن کے ذریعے انسان کے کردار (Character) پر قابو (control) پایا جاتا ہے وہ اس سماج کے اقدار کہلاتے ہیں۔ لیکن فلسفۂ ماہرین بشریات (Anthropologists)، ماہرینِ سماجیات (sociologists)، ماہرینِ نفسیات (Psychologists) اور دیگر ماہرین نے اقدار کو الگ الگ طرح سے بیان کیا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ اقدار کے بارے میں

بات کیوں کریں؟ لیکن انسان کو اقدار کا مفہوم سمجھنا اوراس کو اپنی زندگی سے جوڑنا بے حد ضروری ہے۔

Value Education is Education in values and Education towards Inculcation of values

تعلیم اقدار، اقدار میں تعلیم اور اقدار پیدا کرنے کی تعلیم ہے۔

The True purpose of Education is to make minds, not careers.

William Deresiewicz کا کہنا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ذہن بنانا ہے نہ کے کیریئرز (careers) ۔اقدار کے تصور پر روشنی ڈالنے کے بعد ہم اقدار کی ضرورت اور درجہ بندی پر معلومات حاصل کریں گے۔

4.4 تعلیمی اقدار کی ضرورت (Need for value education)

دور حاضر میں اقدار کی تعلیم بہت ضروری ہے۔جسکی درج ذیل ضروریات ہیں۔

(1) انسان اقدار کے بغیر کام نہیں کرسکتا۔

(2) آج پوری دنیا میں اقدار کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔

(3) ہم اقدار کا علم رکھتے ہوئے بھی تاثراتی طور پر اقدار کی تعلیم سے وابستہ نہیں ہیں۔

(4) سچائی ،عدم تشدد، ہمدردی، تعاون، ایک دوسرے کی مدد اور خدمت خلق سے واقفیت کے باوجود فوری زندگی میں ان اقدار کا فقدان نمایاں ہے۔

(5) لوگوں میں خود غرضی کی وجہ انسانی ہمدردی ،خوش اخلاقی ، بھائی چارگی ،حسن سلوک کے جذبات موہوم ہو چکے ہیں۔سماج میں غنڈہ گردی اور لاقانونیت کا دور نمایاں نظر آرہا ہے۔جس کا ہر دفتر میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

(6) انسان کے اندر انسانیت کے جذبات مفقود ہونے کی وجہ سے انسان صرف ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔جس میں Emotion لفظ کا نام نہیں ہے۔لوگوں کے پاس ایک دوسرے کی تکلیف کو سمجھنے کا احساس نہیں رہ گیا ہے ۔

(7) قومی تعلیمی پالیسی 1986 اور چوہان کمیٹی 1999 نے بھی اقدار کی تعلیم کی سفارش کی ہے اور اس کو ضروری اور اہم قرار دیا ہے۔

(8) تعلیم کے ذریعے اقداری ادراک (Value Perception) سے کہیں زیادہ اس پر عمل آوری پر زور دینا ضروری ہے۔

(9) انسانی اقدار حب الوطنی -قومی یکجہتی -شخصی فرائض -باہمی امداد کا جذبہ -رحم دلی -رواداری -راست بازی -ہمدردی اور ہندوستانی ثقافت سے محبت اقداری تعلیم میں ضروری ہیں۔

طلبا کے اندر کون سے اقدار کو پیدا کیا جائے اس پر مختلف لوگوں نے الگ الگ رائے ظاہر کی ہے۔NCERT نے اس سلسلے میں 83 اقدار کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ کچھ ماہرین تعلیم نے صرف پانچ اقدار کا ہی ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ان کو طلبا میں پیدا کرنا ہی کافی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آرا ٹھیک نہیں ہیں اور عام خیال میں ہے کہ طلبا کے اندر مندرجہ ذیل 20 اقدار کو پیدا کرنا چاہیے۔

(1) تعاون کا جذبہ (2) صفائی (3) آزادی (4) محنت کرنے کی عادت (5) ایمانداری (6) وطن سے محبت (7) انصاف (8) عدم تشدد (9) سائنسی مزاج (10) سیکولرزم (11) خود انضباطی (12) دوسروں کی خدمت (13) سچائی (14) محنت کرنے والوں

کے وقار کا احترام (15) امن (16) عوامی ملکیت کی دیکھ بھال (17) محبت (18) ہمدردی (19) ثقافتی تحمل اور (20) فرض شناسی (Dutifulness)۔

4.5 اقدار کی درجہ بندی (Classification of values)

قدیم ہندوستانی فلسفیوں نے اقدار کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے ایک روحانی اقدار دوسرے مادی اقدار۔ روحانی اقدار وہ ہیں جو ہمارے روحانی کردار کا تعین کرتے ہیں۔ ان کی چار قسمیں ہیں (1) دھرما (2) ارتھ (3) کام (4) موکش۔ مادی اقدار ہماری سماجی زندگی کی سمت کا تعین کرتے ہیں جیسے محبت، ہمدردی تعاون اور حب الوطنی وغیرہ۔ اس کے علاوہ روحانی اقدار بھی ہیں جو ہماری زندگی سے متعلق ہیں۔ اقدار کی درجہ بندی میں Lewis نے انہیں چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) داخلی اقدار (Intrinsic values) (2) خارجی اقدار (Extrinsic values)

(3) پیدائشی اقدار (Inherent values) (4) کلیدی (آلاتی) اقدار (Instrumental values)

(1) داخلی اقدار وہ ہیں جنہیں ہم جان بوجھ کر اپناتے ہیں یا عمل کرتے ہیں۔

(2) خارجی اقدار وہ ہیں جو دوسروں کی تعریف حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔

(3) پیدائشی اقدار سے مراد وہ اقدار ہیں جو انسان کی پیدائش کے وقت حاصل ہوتے ہیں اور فطرت بن جاتے ہیں جیسے محبت، نفرت، ہمدردی، تعاون وغیرہ۔

(4) کلیدی اقدار وہ ہیں جو دوسرے اقدار کے احساس میں مددگار ہوتے ہیں جیسے عدم تشدد وغیرہ۔

اقدار کی درجہ بندی کا کام ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ سماجیات نے کیا ہے جیسے Spranger کی درجہ بندی مقبول ہوئی ہے اسے چھ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) نظریاتی اقدار (Theoretical values) (2) معاشی اقدار (Economic values)

(3) جمالیاتی اقدار (Aesthetic values) (4) سماجی اقدار (Social values)

(5) سیاسی اقدار (Political values) (6) مذہبی اقدار (Religious values)

(1) نظریاتی اقدار۔ وہ اقدار ہیں جنہیں زندگی کے اصولوں پر اپنایا جاتا ہے اور ان کی مدد سے دوسرے اقدار کو حاصل کرتے ہیں۔

(2) معاشی اقدار۔ وہ اقدار ہیں جو انسان کو معاشی شعبہ میں مدد کرتے ہیں۔

(3) جمالیاتی اقدار۔ یہ وہ اقدار ہیں جو جمالیاتی شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

(4) سماجی اقدار۔ یہ وہ اقدار ہیں جو انسان کو سماجی شعبہ میں مددگار ہوتے ہیں۔

(5) سیاسی اقدار۔ یہ وہ اقدار ہیں جو انسان کی سیاسی زندگی میں مددگار ہوتے ہیں۔

(6) مذہبی اقدار۔ یہ وہ اقدار ہیں جو انسان کو مذہبی شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

ماہرین سماجیات نے اقدار کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) مثبت اقدار

(2) منفی اقدار

مثبت اقدار(Positive values): یہ وہ اقدار ہیں جنہیں ہم سماجی سرگرمیوں میں شریک ہو کر سیکھتے ہیں۔ان اقدار سے انسان کے ذاتی اقدار کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

منفی اقدار(Negative values): یہ وہ اقدار ہے جو سماجی طور پر منظور نہیں ہوتے جسے سماج قبول نہیں کرتا ہے۔

ان سب کے علاوہ کچھ اقدار ایسے ہوتے ہیں جن کی نوعیت عالم گیر (Universal) ہوتی ہے یعنی وہ ہر سماج اور ہر ملک کے لوگوں کے لیے ہر وقت اور حالات کے مطابق موزوں ہوتے ہیں۔

4.6 اقداری بحران(Value Crisis)

آج ہمارا معاشرہ اقدار (values) کے لحاظ سے بحران (crisis) میں مبتلا ہے۔شاید ہی کوئی دن گزرتا ہو جس میں ہمیں اقداری بحران سے متعلق کوئی خبر نہ ملتی ہو۔یہ بحران سماجی اخلاقی، معاشی اور سیاسی اقدار میں تمام سطحوں پر پایا جاتا ہے۔ہر طرف خود غرضی، لامحدود لالچ، کرپشن، تشدّد اور تباہی کا منظر، انسانی حقوق کی لڑائی، مایوسی اور اخلاق میں کمی ہو رہی ہے۔یہ اقداری بحران پر دھیان نہ دینے پر نظامِ تعلیم (Education System) کے دھیرے دھیرے collapse ہونے کا ڈر رہے گا۔اب سوچنے کا وقت آ گیا ہے کہ کونسے عوامل ہمارے معاشرے میں اقداری بحران کے ذمہ دار ہیں۔ہم کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ پورے معاشرے کا مسئلہ ہے اور کھوئے ہوئے اقدار(lost values) کو دوبارہ حاصل کرنا اور بنائے رکھنا ہم سب کا فرض بنتا ہے۔

اقدار میں بحران کا ذمہ دار کون ہے؟

(1) **تعلیمی نظام**: کہیں ہم ہماری نو جوان نسل کو درکار تعلیم فراہم کرنے میں ناکام تو نہیں ہو رہے ہیں۔اس بات پر غور کرنا ضروری ہے۔

(2) **خاندان**: خاندان بچے کے لیے پہلا اسکول ہے جہاں بچّے اچھی عادتیں سیکھتے ہیں۔

بچّے کا تعامل(Interaction) سماج کے لوگوں سے کم ہو رہا ہے کیوں کہ بچّے زیادہ وقت نئے الیکٹرانک گیجٹ کے ساتھ گھر میں اور کم وقت اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بیتا رہے ہیں۔ایک متوازن طرزِ رسائی (balanced approach) کی ضرورت ہے جس کی مدد سے ہم بچوں کے اندر اقدار پیدا کریں۔والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بیتائیں اور انہیں یتیم خانے، بزرگوں کے ادارے خصوصی بچوں کے اداروں کا دورہ کرائیں۔آج بچوں کو اچھی زندگی گزارنے کی تعلیم دینا ضروری ہے۔

(3) **سماجی و معاشی حالات(Socio-Economic Conditions)**

انسان جو بنیادی انسانی ضروریات سے محروم اور پریشان ہیں ان کو تعلیم کی قدر پر لکچر دینا مناسب نہیں ہوگا۔اگر معاشرے میں انصاف ہو اور کوئی ایسی غیر امتیازی سلوک نہ ہو ذات پات کا، نسل(Race) کا، دولت کا تو اس معاشرہ میں تعلیم کی اقدار کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔

(4) مادہ پرست رویہ (Materialistic Attitude)

کچھ لوگ مادہ پرست بن چکے ہیں۔ وہ کسی بھی طریقے کو اپنا کر پیسہ کمانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انہیں تعلیم کی قدر کی سخت ضرورت ہے۔

(5) پالیسی پر عمل (Policy Implementation)

عملی طور پر ہم پالیسی کے نفاذ کے لیے کاغذی خاکے تو خوب بناتے ہیں لیکن اس کے نفاذ کے لیے درکار لازمی پالیسی پر عمل آوری کے لیے تخلیقی کاوشیں اختیار نہیں کرتے۔

(6) مسابقتی سماج (Competitive Society)

اس دورِ مسابقت میں ہر انسان چوٹی کے مقام (Top position) پر رہنا چاہتا ہے اور یہ بھاگ دوڑ اس کے لیے مشکل کیوں نہ ہو، وہ کم وقت میں آسان طریقوں سے سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کو اقدار کی کوئی پرواہ نہیں بتایۓ ایسے حالات میں کیا کریں؟ اچھا جینے کے لیے اقدار کی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

انگریزی میں To Live یعنی زندہ رہنے سے متعلق ایک معنی خیز جملہ اس طرح ہے۔

To LIVE we need Lessons In Value Education

(7) سیاسی استحصال (Political Exploitation)

سیاسی رہنماؤں میں سے کچھ لوگ اپنے خودغرض مقاصد کے حصول کے لیے عوام کا استحصال کرتے ہیں اور اس کی بیداری لوگوں میں ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس قسم کے مفاد پرست سیاسی رہنماؤں کے استحصال (Exploitation) سے بچے رہیں۔

4.7 اقدار کے فروغ کی طرزِ رسائیاں (Approaches to Inculcate Values)

(i) اساتذہ کو وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے اپنے نظریاتی حدود (Ideological limitations) کے آگے کام کرنا چاہیے۔

(ii) ماہرین سے اقدارِ تعلیم پر توسیع خطبات (Extension Lectures) کا انتظام کرنا۔

(iii) نصاب میں ایسے تعمیری منصوبے (Constructive Projects) کو فروغ دینا جس سے اقدار کا فروغ ہو۔

(iv) تعلیمی اداروں میں باقاعدہ مقابلوں کا انتظام ہو جس میں سمینار، مباحثوں، خطابت، مضمون نویسی اور ورک شاپس وغیرہ کا انتظام ہو۔

(v) طلبا کو دنیا میں وسیع امن کے فروغ دینے میں اقوام متحدہ (UNO) کا کردار اور UNO کی کوششوں کی جانکاری دینا۔

(vi) اسلامی تعلیمات کے مطابق ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور ہندوستان میں بھی یہ تصور رہا ہے کہ واسدایو کٹمبا کم یعنی ساری دنیا ایک خاندان ہے، اس بات کی اہمیت کو سمجھنے میں طلبا کی مدد کرنا۔

(vii) تعلیمِ اقدار (value education) تمام تعلیمی اداروں میں ہر سطح پر (K.G to P.G) لازمی ہونا چاہیے۔

(viii) تعلیمی ادارے امن کو فروغ دینے کی سمت میں کام کریں۔

(ix) اساتذہ social media کے ذریعے اچھے videos طلبا کو بھیجیں جن سے طلبا میں اقدار کا فروغ ہو۔

(x) نظریہ (theory) عمل کے بغیر بیکار ہے اور عمل نظریہ کے بغیر خطرناک ہے۔ نظریہ اور عمل دونوں سے اقدار کا فروغ ہوتا ہے۔ اقدار کو نصابی اور ہم نصابی سرگرمیں سے فروغ دینا چاہیے۔

4.8 اقدار اور خوشحال زندگی (Values and Harmonious life)

دھرم، ارتھ، کاما اور موکشا ہندوستان کے قدیم اقدار ہیں۔ اقدار ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے جڑے ہیں۔ ہمارے ملک کا ہر بچہ سچائی، عدم تشدد، ہمدردی، تعاون اور خدمت خلق کا جذبہ اپنی حقیقی زندگی میں اپناتا ہے تو اس کی زندگی ہم آہنگ زندگی بن جاتی ہے۔

"Behave Politely to those who do not know you; forgive those who have opressed you; give to those who have never given you anything; and make brothers of those who have denied their brotherhood with you" - Islam

اسلام نے پیار، محبت، بھائی چارے پر زور دیا ہے۔

"We should all live together, work together and there should be no jealousy" - Hinduism

ہندو دھرم نے واسدایو کٹمبکم کا تصور پیش کیا۔

All of you have unity of spirit, sympathy, love for one another, a tender heart, and a humble mind" - Christianity

عیسائی مذہب نے پیار، محبت، ہمدردی، اور خدمت پر زور دیا ہے۔

ہر مذہب کا اشارہ تحمل/رواداری (Tolerance)، ہمدردی یا رحم (Compassion) اور ایک دوسرے کو سمجھنے (Mutual Understanding) پر ہے۔ کیوں نہ ہم سب ان کو اپنی زندگی میں اپنا کر خوشحال زندگی بنائیں۔

Core Values For Harmonious Life. Once you can achieve peace within yourself, you are a step closer to your goal to live a harmonious life.

ہم آہنگ زندگی کے لیے بنیادی قدر: جب آپ اپنے اندر طمانیت محسوس کرتے ہیں تب اپنے مقصد میں آپ ایک خوشحال زندگی کی جانب قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔

مختلف کمیٹی اور کمیشن نے بھی اقدار کے فروغ کے لیے زور دیا۔ NPE-1986 کے مطابق دس اہم اقدار یہ ہیں۔

1۔ تحریکِ آزادی ہند کی تاریخ (History of India's Freedom Movement)

2۔ آئینی ذمہ داریاں (Constitutional Obligations)

3۔ فطری شناخت کی پرورش کے لیے ضروری کلاسیکی مواد

(Classical content essential to nurture natural identity)

4۔ عام ہندوستانی تہذیبی ورثہ(Indian common cultural heritage)

5۔ مساوات پسندی(Equalitarianism)

6۔ جنسی مساوات(Equality of Sexes)

7۔ ماحولی تحفظ(Protection of Environment)

8۔ سماجی رکاوٹوں کو دور کرنا(Removal of Social Barriers)

9۔ مختصر خاندان کے تصور پر عمل کرنا(Observance of Small Family Norms)

10۔ سائنسی رجحانات کی ذہن نشینی(Inculcation of Scientific Trends)

4.9 یاد رکھنے کے نکات(Points to Remember)

اگر ہم اپنے سماج کو غور سے دیکھیں تو یہ پائیں گے کہ لوگوں کا ایک دوسرے پر سے اعتبار اٹھ رہا ہے اور سماج میں بعض لوگ ہر چھوٹی بات پر تشدّد پر اُتر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان اپنی تہذیب اور انسانیت کو چھوڑ کر منفی رویہ(Negative Attitude) اختیار کر رہے ہیں اور Materialistic world کی طرف دوڑ رہے ہیں ۔ آپ سمجھ لیجیے کہ تعلیم بینک(Bank) کی طرح ہے جس میں اقدار، رقم (currency) اور مان لیجیے کے آپ کے Education System میں values نہیں ہیں تو Education system کس کام کا؟ طلبا میں اقدار کو فروغ دینے کے لیے اساتذہ، خاندان، Peer Group، Court & Law، سماج، Mass Media کا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہر شخص اقدار پر مبنی سماج (value based society) کو قائم کرنے میں مدد کریں اور اپنی زندگی ہم آہنگ زندگی بنائیں۔ اس اکائی میں اقدار کا تصور، اس کی درجہ بندی، اقدار میں بحران، اقدار کے طرزِ رسائی اور خوشحال زندگی کے لیے اقدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆ لفظ قدر(value) کی ابتدا Latin زبان کے لفظ Valerei سے ہوئی ہے۔ جس کے معنی ہے اہمیت۔ یعنی اقدار سے صرف نظر کر کے ساری تعلیم صفر ہے۔

☆ تعلیمِ اقدار(value education) اقدار کی تعلیم اور تعلیم کے ذریعے اقدار کو پروان چڑھاتا ہے۔

☆ تعلیم کا اصل مقصد ذہن بنانا ہے نہ کہ کیریئرز (careers)

☆ Lewis نے اقدار کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) داخلی اقدار(Intrinsic values)(2) خارجی اقدار (Extrinsic Values)(3) پیدائشی اقدار(Inherent values) اور(4) کلیدی/آلاتی اقدار (Instrumental values)

☆ ماہرینِ سماجیات (Sociologists) نے اقدار کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔(a) مثبت اقدار(Positive values) اور(b) منفی اقدار(Negative values)

☆ عالمی اقدار (universal values) ہر سماج اور ہر ملک کے لوگوں کے لیے ہر وقت اور حالات کے مطابق موزوں ہوتے ہیں۔

☆ آج سماجی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی اقدار میں تمام سطحوں پر بحران پایا جاتا ہے۔

To live we need Lessons in Value Education

(یعنی زندہ رہنے کے لیے ہمیں تعلیمِ اقدار کے اسباق کی ضرورت ہے۔)

☆ تعلیمِ اقدار (value education) تمام تعلیمی اداروں میں ہر سطحوں پر(K.G to P.G)لازمی ہونا چاہیے۔

☆ ہر مذہب کا اشارہ تحمل(Tolerance)، ہمدردی(Compassion) اور ایک دوسرے کو سمجھنا Mutual Understanding پر ہے۔ کیوں نہ ہم سب اس کو اپنی زندگی میں اپنا کر خوشحال زندگی بنائیں۔

4.10 کلیدی الفاظ(Key Words)

الفاظ	معنی
اقدار (Values)	عام طور پر سماج جن معیارات (Standards) کو اہمیت دیتا ہے اور جن کے ذریعے انسان کے کردار (Behaviour/character) پر قابو(control) پایا جاتا ہے۔
اقدار کی تعلیم (Value Education)	تعلیم کے ذریعے طلبا کی شخصیت میں اقدار کو پروان چڑھانا۔
مثبت اقدار (Positive Values)	یہ وہ اقدار ہیں جنہیں ہم سماجی سرگرمیوں میں شریک ہو کر سیکھتے ہیں اور جن سے ہمارے اقدار رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔
منفی اقدار (Negative Values)	یہ وہ اقدار ہیں جو سماجی طور پر قبول نہیں کیے جاتے ہیں۔

بنیادی اقدار(Core values) صحیح برتاؤ(Right Conduct)، عدم تشدد(Non-violence)، محبت(Love)، امن(Peace)، سچائی(Truth)

4.11 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں(Unit End Activities)

معروضی جوابات کے حامل سوالات:

(1) فلسفے میں اقداریات(Axiology) کن امور سے بحث کرتی ہے؟

(a)علم (b)حقیقت (c)اقدار (d) ثقافت

(2) بچے کی تعلیم کے لیے پہلا مدرسہ کون سا ہے؟

(a)سماج (b)دوست احباب (c)خاندان (d)اسکول

(3) ہندوستانی آئین کے مطابق سیکولرزم کا مطلب کیا ہے؟

(a) کسی مذہب کی عزت نہ کرنا (b) تمام مذاہب کی مساویانہ عزت کرنا

(c) حکومت کا مذہبی تحریکات پر کنٹرول (d) تمام شخصی مذہبی قوانین

(4) تعلیمِ اقدار کہاں پائی جاتی ہے؟

(a) صرف گھر میں (b) صرف سماج میں

(c) صرف مدرسہ میں (d) ان سبھی میں

(5) "غیر اقداری تعلیم اتنی مفید ہے کہ وہ انسان کو ایک چالاک شیطان (clever devil) بنا دیتی ہے" یہ کس نے کہا؟

C.S Lewis(a) (b) گاندھی جی

(c) ابولکلام آزاد (d) ان میں سے کوئی نہیں

(6) "تعلیم کا حقیقی مقصد "ذہن سازی" ہے نہ کہ "کریئر سازی" کس نے کہا؟

(a) ٹیگور William Deresiewicz(b)

(c) ذاکر حسین (d) ان میں سے کوئی نہیں

(7) core human values _____, _____, _____, _____, _____ ہے۔

(8) UNESCO رپورٹ کے تحت تعلیم کے چار ستون (pillars) ___, ___, ___ اور _____ ہیں۔

(9) اقدار _____ لفظ سے اخذ کیا گیا ہے۔

(10) "تعلیم خوشحالی میں ایک زیور ہے اور مصیبت میں ایک پناہ گاہ" _______ نے کہا

(11) لفظ قدر (Value) کی ابتدا _____ زبان کے لفظ ___ سے ہوئی جس کا مطلب ہوتا ہے اہمیت

(12) اقدار کے تصور کے تین مرحلے ہوتے ہیں _ پہلا وقوفی (cognitive) مرحلہ، دوسرا تاثراتی (Affective) مرحلہ، اور تیسرا ___ مرحلہ

(13) _____ نے اقدار کو Positive values اور Negative values میں تقسیم کیا

مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

(1) کوئی پانچ واقعات کی فہرست تیار کیجیے جس میں آپ نے دوسرے مذاہب کے افراد کی مدد کی؟

(2) اقدار کی تعریف بیان کیجیے ؟

(3) اقدار کی تعلیم (Value education) کی وضاحت کیجیے؟

(4) اقدار کی درجہ بندی (Classification) پر ایک نوٹ لکھیے؟

طویل جوابات کے حامل سوالات؛

(1) اقداری تعلیم کو انسان میں پیدا (Inculcate) کرنے کے لیے مختلف طرز رسائیوں (approaches) کی فہرست تیار کیجیے؟

(2) اقدار پر مبنی سماج value based society پیدا کرنے کے لیے معلم کے کردار (role) پر روشنی ڈالیے؟

(3) مشہور شخصیتوں کی زندگی کے کسی ایک واقعے کو لے کر سچائی ایک قدر (truthfulness as a value) ۔اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کیجیے؟

4.12 تجویز کردہ مواد (Suggested Readings)

1- Jamal Sajid (2012).Education in Emerging Indian society, Delhi,

2- Shipra Mrunalini .T(2015) Philosophical Foundations of Education, Hyderabad, Neel Kamal publications publishers

3- Lachanna G et.al(2015)Foundations of Education,Hyderabad Neel kamal publishers

4- Ghanta (2004)Foundations of Educations , Hyderabad Neel Kamal

5- Vanaja M et.al(2011) value oriented Education,Hyderabad, Neel Kamal

6- Value Education Google weblight.com

7- Education _General Knowledge

8- www.gktoday.in>blog>importance

9- https://en.m.wikipedia.org wiki valuechildren,deccan Herald

10- Brahma Kumar Nikung(2014)august 03,sunday value.education for

11- Sanjna vij(2010)december 08,crisis of values _who is responsible.

اکائی 5۔ تدریس بہ حیثیت پیشہ

(Teaching as as Profession)

اکائی کے اجزا؛

5.1 تعارف(Indrodution)

5.2 مقاصد(Objectives)

5.3 معلم ۔ پیشہ ورانہ استعداد اور پابندئ عہد

(Teacher : Professional Competencies & Commitments)

5.4 معلم بہ حیثیت معمار قوم (Teacher as a National Builder)

5.5 معلم بہ حیثیت خالق اور تسہیل کار علم(Teacher as a Creator and facilitator of Knowledge)

5.6 معلم کی پیشہ ورانہ اخلاقیات (Professional Ethics of Teacher)

5.7 معلم اور مستقبل کا سماج (Teacher and the Future Society)

5.8 یاد رکھنے کے نکات (Points to Remember)

5.9 فرہنگ(Glossary)

5.10 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں(Unit End Activities)

5.11 تجویز کردہ مواد(Suggested Readings)

5.1 تمہید (Introduction)

بلا شبہ تدریس ایک مقدس پیشہ ہے۔نئی نسل کو بنانا،سنوارنا اور انہیں مستقبل کے کامیاب اور موثر شہری کا روپ دینا اس پیشے کی ذمہ داری ہے۔ہمارے لیے اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ خود پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ اپنا تعارف اس طرح کیا ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"

معلم کا مقام و مرتبہ بے شک بہت بلند ہے اسی کے لحاظ سے اس کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہیں۔حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ اور پر خطر ہوں سماج گروہ اور فرد کو اپنے مستقبل سے بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔اور مستقبل کا دارومدار بڑی حد تک بچوں اور نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر منحصر ہوتا ہے۔تعلیم و تربیت کی عظیم ذمہ داری بلاشبہ معلم بخوبی انجام دے سکتا ہے،اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی قوم و ملک اور سماج کا مستقبل اس کے اساتذہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔معلم کا فریضہ صرف کتابی علم کو اپنے طلبا تک منتقل کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپنے پیشہ وارنہ اخلاقیات کی روح اور حدود کو سمجھتے ہوئے اسے اپنے طلبا کے علم و ہنر اور تجربات کی تخلیق بھی کرنی ہوتی ہے۔اور پھر اپنے پیشہ ورانہ پابندی عہد کے ذریعے اس بات کو یقینی بنانا ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت معمار قوم ایک کامیاب اور درخشاں مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔اس اکائی میں ہم معلم کی پیشہ وارانہ استعداد (competencies professionnal) پابندی عہد (Commitment) اس کا کردار بحیثیت معمار قوم و بحیثیت خالق وتسہیل کار علم، پر غور کرتے ہوئے اس کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ مستقبل کے سماج کی تشکیل میں معلم کا غیر معمولی کردار ہے۔

5.2 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1 تدریس کے پیشے کے بارے میں مکمل طور پر واقفیت حاصل کر سکیں اور تدریس کو ایک پیشے کی حیثیت سے مانیں۔

2 معلم کو بحیثیت قومی معمار کیوں کہا جاتا ہے۔اس کی مکمل تفہیم حاصل کریں۔

3 ایک معلم اپنے پیشہ وارانہ استعداد کو کس طرح سے بڑھا سکے گا۔اس سے واقف ہو پائیں۔

4 معلم کی پیشہ ورانہ اخلاقیات سے واقف ہوں۔

5 مستقبل کا سماج بنانے میں معلم کیا رول ادا کرتا ہے۔اس کی پوری معلومات حاصل کر سکیں۔

5.3 معلم: پیشہ وارانہ استعداد اور پابندی عہد

(Teacher : Professional Competencies and Commitments)

پیشہ ورانہ استعداد؛

تدریس ایک اہم پیشہ ہے اس کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معلم کے پاس پیشہ ورانہ استعداد (Professional

Competencies)اور پابندی عہد(Commitment) ہوں۔ پیشہ ورانہ استعداد کو ایک خاکے کی مدد سے اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں۔

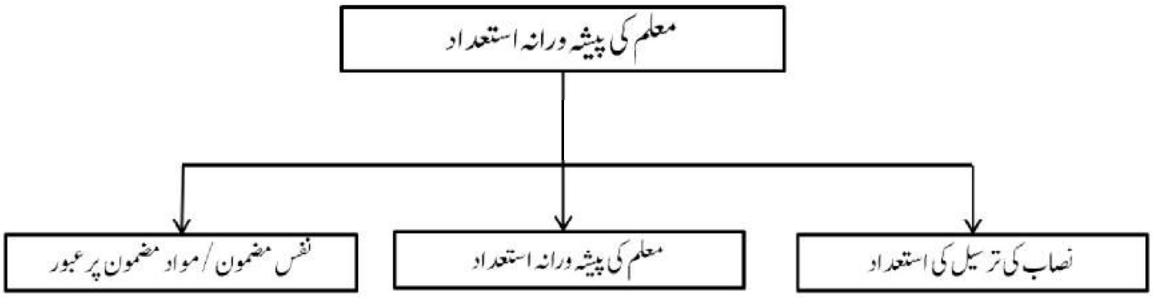

(الف) نفس مضمون یا مواد مضمون پر عبور:

علم ایک اکائی ہے اور ہم اپنی سہولت کے لیے اسے مختلف مضامین میں تقسیم کرتے ہیں۔ دور حاضر میں ہر مضمون کے مواد میں بے تحاشہ اضافہ ہورہا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اور اس پر مختلف سائیٹس تک طلبا کو بھی دست رس حاصل ہے۔ ایسے میں معلم کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مواد مضمون پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے سبق کی تیاری میں صرف نصابی کتاب (Text Book) دستی کتاب (Hand Book) پر انحصار نہ کرتے ہوئے دیگر حوالہ جاتی کتب(References Books) رسالہ جات (Magazines) اور انٹرنیٹ جیسے جدید ذرائع سے بھی حسب ضرورت استفادہ کریں۔

(ب) تدریسی امدادی اشیاء (Teaching Aid):

معلم کو چاہیے شامل نصاب مواد کو موثر انداز میں طلبا تک پہنچانے اور ان کے اکتساب کو موثر بنانے میں تدریسی امدادی وسائل کا غیر معمولی کردار ہوتا ہے۔ نصابی کتاب میں تصاویر، خاکے جدول اور چارٹس کو شامل کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ بھی اس طرح کے وسائل کا بھرپور استعمال کرے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسے جدید وسائل کا استعمال کر کے اپنی تدریس کو دلچسپ، آسان اور موثر بنائے۔ تصورات کو واضح کرنے کے لیے معلم تختہ سیاہ پر اپنی فنکارانہ صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے تصاویر اور خاکے وغیرہ وغیرہ بنائے تو انکا بھی اپنا اثر ہوتا ہے۔

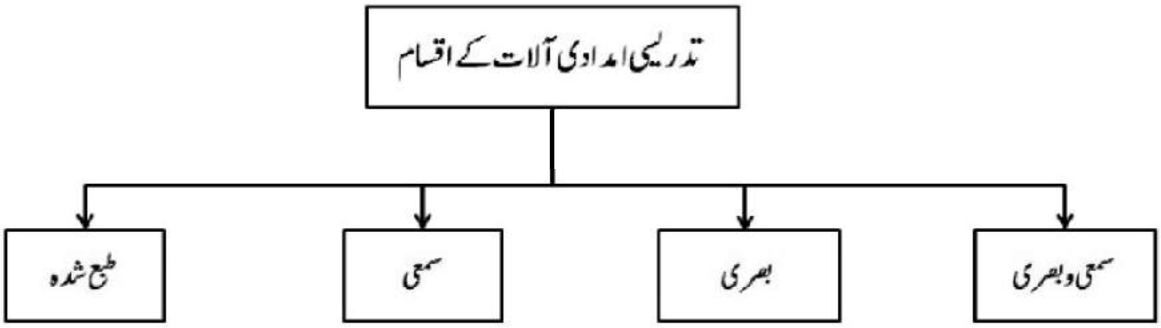

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایسے تدریسی امدادی آلات قابل ترجیح ہیں جو سرگرمی پر مبنی ہوں۔

تدریسی امدادی آلات کی پانچ خوبیاں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

1) صحت یا درستگی (Accuracy) یعنی تصور کو اس کی صحت کے ساتھ واضح کرنا۔

2) وضاحت (Clarity) تصور کو واضح طور پر بیان کرنا۔

3) پائیداری (Durability) یعنی زیادہ عرصے تک استعمال کی جا سکے۔

4) استعمالیت (Practicability) استعمال کرنے میں سہولت ہو۔

5) سستی (Low Cost) تیاری اور حصولیابی میں کم خرچ ہو۔

ج) نصاب کی ترسیل کی استعداد (Transaction):

کمرہ جماعت میں نصاب کہ ترسیل کی استعداد (Transaction) کی بنیاد پر طلبا کے اکتساب میں مدد کرتا ہے۔ روایتی طرز تعلیم میں کمرۂ جماعت کا تعاون معلم اور طلبا کے درمیان محدود سمجھا جاتا تھا۔ تجربات اور تحقیقات کی روشنی میں دور حاضر میں معلم کے لیے ضروری ہے قو می مقاصد، نصاب تعلیم، نصاب مضمون اور نصابی کتب کا بغور مطالعہ کر کے پڑھائے جانے والے اسباق، اکائیوں اور ذیلی اکائیوں کی خوب اچھی طرح تیاری کرے اور پڑھائے جانے والے اصول وحقائق اور تصورات کا واضح ذہنی خاکہ بنائے۔

کمرہ جماعت کا تعامل کے مزید ابعاد (Dimensions) سامنے آئے ہیں لہذا انہیں خاکے کی مدد سے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

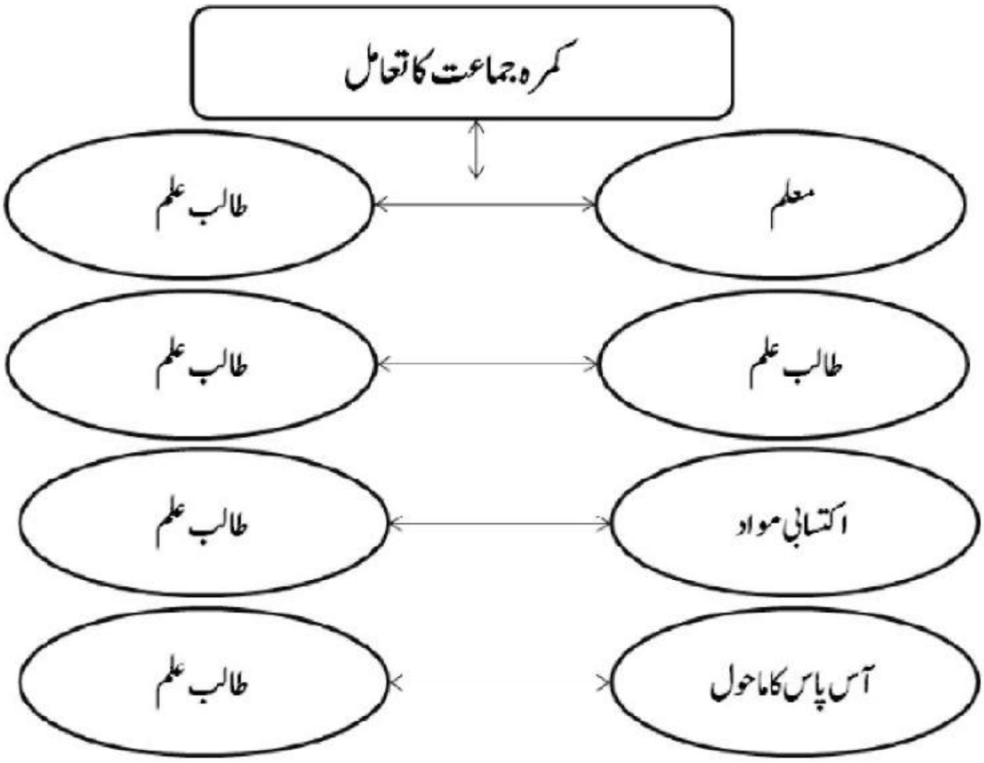

کمرۂ جماعت کے تعاملات میں جمہوری اقدار کا خصوصی خیال رکھا جانا چاہیے اور ہر فرد کو یہ بات تسلیم کرنا چاہیے کہ جس طرح مجھے اظہار خیال کی آزادی ہے اسی طرح دیگر شرکا کو بھی یہ شرف حاصل ہے اور ہم کو چاہیے کہ ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاتے ہوئے خوشگوار اور پرامن ماحول میں صبر وتحمل اور رواداری کے ساتھ ان تعاملات کو آگے بڑھائیں اور ان سے سیکھیں اور ایسا کرتے ہوئے نظم وضبط کو بھی

بحال رکھیں۔

طلبا سے تعامل کو موثر بنانے کے لیے معلم کو مختلف طریقہ ہائے تدریس، طرز رسائی، تدریس کے فن اور اصول اور مہارتوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔اسی طرح طلبا کے آپسی تعامل (Interaction) کے دوران معلم کے ذہن میں یہ بات واضح رہے کہ طلبا ایک دوسرے سے بھی خوب سیکھ سکتے ہیں اور کمرہ جماعت میں بعض طلبا صاحب وسائل (Resource Students) بھی ہوتے ہیں۔اور ان سے بھرپور استفادہ کیا جانا چاہیے۔

طلبا کے درمیان تعاملات کی کامیابی کے لیے معلم کی حوصلہ افزائی غیر معمولی کردار ادا کرتی ہے۔یہی بات طلبا اور اکتسابی مواد کے درمیان تعامل کے لیے بھی صحیح ہے۔اس تعامل کا بامعنی ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ یہ مواد، خود اکتسابی مواد ہو جو طلبا کو مختلف النوع، آسان اور دلچسپ تجربات کی فراہمی کا ذریعہ ہو۔خود طلبا بھی اس قسم کا مواد تیار کر سکتے ہیں۔اس سے نہ صرف یہ کہ ان کی خوداعتمادی میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ پر مسرت انداز میں سیکھیں گے۔

طلبا کے اپنے آس کے ماحول سے تعامل کے لیے تعلیمی سیر، دورے، انٹرویو، مختلف البم اور collections کی تیاری وغیرہ کی منظّم منصوبہ بندی ضروری ہوتی ہے۔

اس بات کا خیال رہے کہ ان تمام تعاملات میں معلم کا کردار صرف روایتی اور رسمی قسم کا نہیں ہونا چاہیے۔بلکہ اسے غیر رسمی (informal) اور بے رسمی (formalnon) کردار کو بھی بہ حسن وخوبی سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔

معلم کی پیشہ وارانہ پابندئ عہد (Teacher's Professional Commitment)

تدریس کی درجہ بندی ایک پیشہ کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔یہ صرف زندگی گزارنے کے لیے درکار پیشہ کمانے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی سماجی خدمت ہے جس کے ذریعے معلم سماجی فروغ میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔اسی لیے ضروری ہے کہ معلم مستقلاً اپنے پیشے کے تئیں پابند عہد رہے۔

شخصی پسند اور ناپسند سے اوپر اٹھ کر معلم کے لیے مطلوبہ علم اور مہارتوں کا حصول ضروری ہے۔

پیشہ وارانہ پابندی عہد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی گروہ کے افراد میں اپنے پیشے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا احساس ہو۔پابندی عہد (commitment) کے دو لازمی اجزا (component) ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا یہ کہ فرد کو متعلقہ پیشے سے وابستگی پر فخر ہو اور دوسرا یہ کہ اپنے پیشہ وارانہ فروغ کے لیے اس کے اندر گہری خواہش اور رغبت ہو۔تدریس تو فی الواقع ایسا پیشہ ہے جس میں معلم کو ان بچوں کے بنانے اور سنوارنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے، جنہیں سماج مکمل اعتماد کے ساتھ معلم کے سپرد کرتا ہے، اس اعتماد پر پورا اترنے کا تقاضہ یہی ہے کہ ایک پابند عہد معلم صرف اسکول کے اوقات کے درمیان ہی مصروف کار نہیں ہوتا بلکہ ان اوقات کے بعد بھی اس کا ذہن طلبا، ان کے فروغ اور اجتماعی اور انفرادی کارکردگی کو بہتر بنانے سے متعلق خیالات اور ان کے تفکرات میں مصروف رہتا ہے۔پابند عہد معلم نہ صرف طلبا کے ہمہ جہت فروغ کا خواہاں ہوتا ہے، بلکہ وہ خود اپنے پیشہ ورانہ فروغ کے لیے بھی سخت محنت کرتا ہے، تاکہ اپنی خدمات بہتر سے بہتر طور پر انجام دے سکے۔

اساتذہ اپنے پیشے کی عظمت کے عین مطابق پیشہ ورانہ اخلاقیات کا خیال رکھتے ہیں تحمل نرمی اور انکساری ان کے وہ امتیازی اوصاف ہیں جن کے ساتھ وہ طلبا، سرپرستوں اور سماج کے دیگر لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں انہی اوصاف کی بنا پر اساتذہ کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا

ہے۔ان شخصی اوصاف اور پیشہ ورانہ استعداد کے حسین امتزاج سے معلم کی شخصیت تشکیل پاتی ہے جو اسے اپنے پیشے کے تئیں پابندی عہد بناتی ہے۔

پابندی عہد(commitment)وابستگی کی وہ کیفیت ہے جو فاعل (معلم) اور اس کے میدان عمل کے درمیان رشتے کا تعارف کرواتی ہے۔ پابندیٔ عہد ایک عمل ہے،اس عمل میں فاعل مختلف خیالات میں سے اس متبادل کا انتخاب کرتا ہے جو اس کی دانست میں اس کے پیشے کے فروغ کے لیے سب سے بہترین ہو۔

پابندیٔ عہد کے مختلف میدان(Areas of Committment)

الف:طلبا کے لیے پابندی عہد۔

بچوں کو ایسے معلم کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی ضروریات کو حساسیت کے ساتھ سمجھتا ہو۔وہ ایسے معلم کی چاہت رکھتے ہیں جو ان کی جبلّتوں،اکتسابی ضرورتوں،میلانوں،صلاحیتوں اور لیاقتوں کو سمجھ سکے۔پیشۂ تدریس کو اختیار کرنا گویا طلبا کے فروغ اور ترقی کا عہد کرنا ہے۔

ب:سماج کے لیے پابندی عہد۔

اسکول اور سماج کے درمیان ایک علامتی رشتہ ہوتا ہے،اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج کو تعلیم (جو تا عمر جاری رہنے والا عمل ہے۔) کی اہمیت سے کما حقہ واقف کرائے اور افراد کو اس تناظر میں ترغیب دلائے اس لحاظ سے معلم اپنے سماج کا پابندی عہد ہوتا ہے۔

ج: پیشے کے لیے پابندی عہد۔

سماج کے ذریعے معلم کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے مستقبل کو تابناک بنائے اور بہترین تعلیم و تربیت کے ذریعے انہیں بنائے اور سنوارے۔پابندی عہد اساتذہ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے تجدد انہ(Innovative) طریقے تدریس کا استعمال کریں کہ طلبا کا اکتسابی عمل موثر ہو جائے۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ بذات خود اپنے پیشے کے تئیں پابندی عہد کا مظاہرہ کریں اور طلبا کے اجتماعی اور انفرادی اکتساب کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

د: پیشہ وارانہ اقدامات میں سر بلندی کے لیے پابندی عہد۔

ایسے اساتذہ جو اپنے پیشہ وارانہ اقدامات میں سر بلندی(Excellence) پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور جو اپنے آپ کو بہتر انسان کے بطور ابھارنے پر توجہ دیتے ہیں بالآخر ان کے طلبا ان کے نقشے قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسے اساتذہ کو ان کے طلبا اور سماج کی جانب سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ سبھی کے لیے مینارۂ نور بن جاتے ہیں۔

ذ: بنیادی اقدار کے لیے پابندی عہد۔

ہر سماج اپنے اساتذہ سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ اجتماعی معاملات میں،اپنی شخصی اور ذاتی زندگی میں اقدار پر مبنی طرز رسائی (Approach) اختیار کریں،تاکہ مستقبل کی نسلیں انہیں اپنے لیے مثالی شخصیات کے طور پر دیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں۔

5.4 معلم بہ حیثیت معمارِ قوم(Teacher as a Nation Builder)

تدریس ہی وہ مقدس پیشہ ہے جو انسان سازی اور کردار سازی کے لیے وقف ہے۔معلم وہ پیشے ور ہے جو اپنے ذاتی حالات و تجربات

چاہے وہ کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہوں سے اوپر اٹھ کر طلبا کی شخصیت سازی کو یقینی بنائے۔ اخلاقیات، ایمانداری اور عدل وہ اوصاف ہیں جو طلبا معلم سے ہی سیکھتے ہیں۔ دراصل اسکول اور معلم ہی کردار سازی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اساتذہ نے اپنی مستقل مزاجی، محبت اور قربانی کے ذریعے ہمارے عظیم رہنماؤں کو ایسا راستہ دکھایا جن پر چل کر انہوں نے اس ملک کی تعمیر کی۔ اسی طرح مستقبل میں بھی ملک کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے اساتذہ کا غیر معمولی کردار رہے گا۔ ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، اور ترقی یافتہ سماج کے طور پر اپنے آپ کو ابھارنا ہے تو اساتذہ کی قدر کرنی ہوگی۔ کمرہ جماعت کے باہر بھی اساتذہ کا غیر معمولی کردار ہوتا ہے۔ جس کو سماجی کردار کہا جاسکتا ہے۔ اس کے تحت انہیں اپنے طلبا کو سماجی مسائل کے تئیں حساس بناتے ہوئے سماج کی تشکیل و ترقی میں فعال کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ تدریس کے ساتھ معلم کے دیگر کرداروں میں حوالہ جاتی یا توسطی کردار (Reference Role) جاسوسی کردار (Detective Role) اور سرپرستانہ کردار (Parental Role) نبھانا بھی شامل ہے۔

اکثر یہ بات دیکھی گئی ہے کہ طلبا اپنے معلم کے آداب، انداز گفتگو، رسوم و رواج غرض ایک ایک ادا کو محسوس یا غیر محسوس طریقے سے اپنی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ طلبا کی فکر و خیالات بھی معلم سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک مقبول معلم کی شخصیت طلبا کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ بچے اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی غیر محسوس طریقے سے اپنی زندگی کا نصب العین، مقاصد اور مستقبل کے منصوبے وغیرہ کا تعین کرنے میں اپنے اساتذہ کے فکر و خیالات سے مستفید ہوتے ہیں اور اکثر ان موضوعات پر ان سے تبادلہ خیال کر کے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دیگر کسی پیشے سے متعلق لوگ بدعنوان (Corrupt) ہو جائیں تو شاید ملک و سماج کے لیے اتنا نقصان دہ ثابت نہ ہوں جتنا کہ بدعنوانی کا شکار معلم۔ کیوں کہ اس کی بدعنوانی کا راست اثر نئی نسل پر مرتب ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ بہت آگے تک جاری رہ سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر معلم ایماندار اور اپنے پیشے کے تئیں پابند عہد ہو تو معمار قوم بن جاتا ہے۔ اور اگر خدانہ خواستہ وہ بے ایمان بن جائے اور اس کے پاس پابندی عہد اور اخلاقیات نہ ہوں تو وہ مسمار قوم بن کر قوم و ملک کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے ہر دور اور ہر سماج میں ایمان دار، پابند عہد اور باصلاحیت اساتذہ کی تیاری اور تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے جو بے حد ضروری بھی ہے۔

5.5 معلم بہ حیثیت خالق اور تسہیل کار علم

(Teacher as a Creator and Facilitator of knowledge)

زمانہ ماضی میں معلم کی اہم ذمہ داریوں میں طلبا کو علم فراہم کرنے کا عمل شامل تھا۔ دور حاضر میں تعمیریت (Constructivism) کے نظریے کی مقبولیت نے مذکورہ تصور پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اب یہ بات فرسودہ ہوگئی ہے کہ معلم علم دیتا ہے اور طلبا علم حاصل کرتے ہیں اب نظریہ تعمیریت کے مطابق معلم طلبا کے حصول علم کے لیے خوشگوار ماحول تیار کرتا ہے۔ اور سیکھنے کے لیے درکار تمام ضروری مواد فراہم کر کے کمرہ جماعت میں ایسی سرگرمیوں کا انعقاد کرتا ہے کہ طلبا ان سے تعامل کر کے سیکھ جائیں۔ اس لحاظ سے معلم کی حیثیت روایتی پڑھانے والے کی نہ رہتے ہوئے تسہیل کار (Facilitator) کی بن گئی ہے۔ معلم کے ذریعے تیار کردہ سیکھنے کی صورت حال (Learning Situation) سے تعامل کر کے ہر طالب علم اپنی سابقہ معلومات کی بنا پر نئے علم کی تشکیل خود کرتا ہے۔ اور یہ سب کرنے میں تب ہی کامیاب ہو پاتا ہے جب وہ از

خود فعال کردار (Active Role) ادا کرے۔ ایک معلم اپنے کمرہ جماعت میں طلبا کے سامنے جن علمی سرگرمیوں کا انعقاد کرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تیاری کے لیے اسے نصابی کتب، حوالہ جاتی کتب، رسائل اور دیگر ذرائع جیسے سی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور آن لائن ریسورسیز سے بھرپور استفادہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جو علمی نکات وہ ان ذرائع سے حاصل کرتا ہے انہیں وہ جوں کا توں اپنے طلبا کے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ ان پر غور و خوض کر کے اپنے سابقہ تجربات اور طلبا کی اکتسابی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں ایک رخ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ گویا علم کی تخلیق بھی کرتا ہے اسی لیے وہ علم کا صرف منتقل کرنے والا (Transmiter) نہ ہوتے ہوئے خالق (Creator) بھی ہوتا ہے۔ اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے معلم کو سخت محنت کرنی ہوتی ہے۔ اپنے مطالعے و نظر اور مشاہدے میں وسعت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ اپنے ذہن کو ہر طرح کے تعصّبات سے پاک رکھتے ہوئے ایک مثبت (Positive)، تعمیری (Constructive) اور تخلیقی (Creative) انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

5.6 معلم کی پیشہ ورانہ اخلاقیات (Professional Ethics of a Teacher)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں (Higher Educational Institutes) بالخصوص جامعات (Universities) میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ڈگری حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو بالعموم ایک حلف دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ڈگری کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنے قول و فعل سے اپنی ڈگری اور اپنے ادارے کی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ حلف لینے کی اس رسم کی بعض پیشہ ورانہ تعلیمی ادارے جیسے میڈیکل اور لا (Law) وغیرہ کالجوں میں ایک خاص اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس موقع پر کامیاب ہونے والے طلبا سے اپنے پیشے اور بالخصوص اپنے ٹارگٹ گروپ جیسے مریض، موکلین (Clients) کے تئیں پابندی عہد (Commitment) کا ایک عہد لیا جاتا ہے۔

تدریس بھی ایک مقدس اور عظیم پیشہ ہے۔ نئی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے انہیں مستقبل کے بہترین شہری کے طور پر تیار کرنے کی اہم ذمہ داری اس پیشے کو سونپی گئی ہے۔ اس لیے معلم کا اپنے پیشے اور طلبا کے تئیں پابند عہد ہونا اپنی معنویت رکھتا ہے۔ محض رسمی طور پر حلف لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ بہ حیثیت معلم اپنے پیشے کی اخلاقیات کو اپنے ضمیر کا جز بنانے کی ضرورت ہے۔ معلمین کو اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہوگا کہ......

1. اپنے پیشے کے تئیں ہمیشہ دیانت دارانہ رویہ اختیار کریں گے اور کبھی بھی اپنے طلبا اور دیگر متعلقین کا کسی طرح سے استحصال نہیں کریں گے۔
2. سماج کا ارتقا اور فلاح و بہبود کے لیے بالعموم اور طلبا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بالخصوص اپنے آپ کو وقف کریں گے۔ اور اس بات کی مخلصانہ کوشش کریں گے کہ ذاتی مسائل، مختلف افراد و تنظیموں کی بے جا تنقید یا خوش آمد پرستانہ رویہ سے متاثر ہوئے بغیر تمام طلبا کے ساتھ مساویانہ طور پر منصفانہ رویہ کا مظاہرہ کریں گے اور ان کی ہمہ جہت ترقی کے اس عظیم مشن میں کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات یا شخصی پسند و ناپسند کو حائل نہیں ہونے دیں گے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ملک و سماج سے ذاتی ترقی اور اعزازات کی توقع بھی نہیں رکھیں گے۔

5.7 معلم اور مستقبل کا سماج (Teacher and Future Society)

ہر ملک اور سماج کے اپنے اقدار اور اصول ہوتے ہیں۔ چند بنیادی باتوں کو چھوڑ کر وقت و حالات کے لحاظ سے اکثر چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ دور حاظر میں ایک Vision اور ایک Mission کے تحت بچوں کو زیورِ علم سے آراستہ کر کے ایک درخشاں مستقبل کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری اسکول اور معلم کو سونپی جاتی ہے۔ اس ضمن میں کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ میں ایک بڑا معنی خیز جملہ ملتا ہے۔

"The Destiny of India is now being shaped in her class room"

''ہندوستان کی تقدیر اب اس کے کمرہ جماعت میں تشکیل دی جا رہی ہے۔''

ظاہر ہے کہ اس جملے میں بڑی بنیادی اور اہم بات کی گئی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی ترقی اور انٹرنیٹ اور اس پر موجود مواد کی مقدار اور معیار نے ہمارے تعلیمی نظام کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ آج انتہائی کارآمد چیزیں بڑی آسانی کے ساتھ طلبا کو دستیاب ہیں۔ ان تمام چیزوں کے باوجود معلم کے کردار کی معنویت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کردار میں وقت کے ساتھ ساتھ وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جدید وسائل کے مضرت رساں پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے ان کے مفید پہلوؤں سے خاطر خواہ استفادہ کروانا معلم کی ذمہ داریوں میں ایک نیا اضافہ ہے۔ سماجی مسائل جیسے بے ایمانی، رشوت خوری، عورتوں اور بچوں پر مظالم، جہیز کی لعنت، عدم تحمل اور عدم رواداری جیسی چیزوں سے پاک سائنسی مزاج، سیکولرازم اور انسانی اقدار پر مبنی سماج کی تشکیل جو ترقی کی نئی نئی منزلوں کی طرف بھی رواں دواں رہے وقت کی ضرورت ہے۔ اور مستقبل کے اس سماج کی تشکیل و تعمیر اسکول اور معلم کی ذمہ داری ہے۔ مستقبل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلبا کی ایسی تعلیمی و تربیت کا اہتمام کہ جس سے طلبا اپنے مستقبل کی زندگی میں کامیاب ہوسکیں ایک ایسا فریضہ ہے جس کو پورا کرنے کے لیے معلم کا وسیع النظر اور دور اندیش ہونا ضروری ہے۔

مستقبل کے سماج کی تشکیل و تعمیر کے لیے معلم میں درج ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ تعلیم و تربیت کے ذریعے بہترین سماج کی تعمیر و تشکیل میں یقین

2۔ اپنے پیشے، طلبا اور سماج اور شخصی ارتقا کے تئیں پابندی عہد

3۔ ایمانداری اور محنت کا جذبہ

4۔ طلبا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے منظّم منصوبہ بندی

5۔ جوش و خروش کے ساتھ اپنے منصوبہ پر عمل آوری

6۔ قائدانہ صلاحیت اور اچھی ترسیل کی مہارت

7۔ وسیع القلبی اور وسیع النظری

8۔ سماجی مقاصد اور سماجی اقدار سے مکمل آگہی اور ان اقدار کو اپنے اور طلبا کی زندگی میں عملی طور پر برتنے پر زور

9۔ ماحولیات کے مسائل اور اقداری بحران سے کماحقہ واقفیت اور بہتری کے لیے لگن کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ

10۔ بلا لحاظ مذہب و ملت، علاقہ و ملک، زبان و ثقافت، رنگ و نسل اور امیر و غریب سب کو ساتھ لے کر بہترین سماج کی تعمیر و تشکیل کے

لیے انتھک اور مسلسل کام کرنے کا جذبہ

5.8 یاد رکھنے کے نکات (Point to Remember)

1۔ تدریس ایک مقدس پیشہ ہے۔ معلم صرف پیسہ کمانے کے لیے تدریس اختیار نہیں کرتا بلکہ بہترین تعلیم و تربیت کے ذریعے ملک و سماج کے لیے اچھے شہریوں کی تیاری بھی اس کے مقاصد میں شامل ہوتی ہے۔

2۔ کامیاب اور موثر معلم کا پیشہ ورانہ استعداد کا اہل اور پابند عہد ہونا ضروری ہے۔

3۔ معلم کی پیشہ ورانہ استعداد میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں۔

☆ نفس مضمون پر عبور (Command Over the Content Knowledge)

☆ تدریسی امدادی آلات کی تیاری اور موثر استعمال (Preparation of Teaching Aids and efective Uses)

☆ نصاب کا معملہ (Curriculum Transaction)

4۔ نفس مضمون اور مواد مضمون پر عبور حاصل کرنے کے کیے درسی کتاب کے بہ غور مطالعے کے ساتھ حوالہ جاتی کتابوں کا مطالعہ، متعلقہ مضامین کے رسائل و جرائد سے استفادہ، سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے علاوہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسے جدید وسائل کا موثر استعمال ضروری ہے۔

5۔ تدریسی امدادی آلات کے استعمال سے معلم اپنی تدریس کو آسان، موثر اور دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

6۔ تدریسی امدادی آلات کی تیاری کے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ آسان (simple)، دلچسپ (Interesting)، اور موثر (Effective) ہو۔

7۔ تدریسی امدادی آلات عام طور پر چار قسم کے ہوتے ہیں

سمعی (audio)، بصری (Visual)، سمعی و بصری (Audio Visual)، طبع شدہ (Printed)

8۔ تعلیمی امدادی آلات کی پانچ خوبیاں ہوتی ہیں۔

☆ درستگی (Accuracy)

☆ وضاحت (Clarity)

☆ پائیداری (Durability)

☆ استعمالیت (Practicability)

☆ سستی (Lowcost)

5.9 فرہنگ (Glossary)

معلم کی پیشہ ورانہ استعدادیں (Teacher Competencies)	ایسی استعداد جو معلم کو پیشہ تدریس کے اہل بناتی ہے جیسے نفس مضمون اور مواد مضمون پر عبور، تدریسی امدادی وسائل (Teaching Aids) کی تیاری اور موثر استعمال وغیرہ۔
معلم کی پابندی عہد (Teachers Commitment)	اپنے پیشے، طلبا اور سماج کی بہتری کے لیے معلم کا اپنے آپ سے کیا گیا عہد اور اس کی پابندی۔
معمار قوم (Nation Builder)	ملک وقوم کی تعمیر وتشکیل میں معلم کے غیر معمولی کردار کے مدنظر اسے معمار قوم کہا جاتا ہے۔
خالق اور تسہیل کار علم (Creator and Facilitator)	نظریہ تعمیریت (Constructivism) کے مطابق معلم کو علم فراہم کرنے والی شخصیت کے طور پر نہ دیکھتے ہوئے طلبا کے اکتساب (Learning) کے لیے درکار خوشگوار ماحول و وسائل اور اکتسابی تجربات کا منظّم انعقاد کرنا ہوتا ہے اسی لیے اسے تسہیل کار علم (Facilitator of Knowledge) کہتے ہیں۔ چوں کہ معلم کتابی علم کو جوں کا توں طلبا کے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ان نکات میں اپنے تجربات اور سابقہ علم کی آمیزش کرتے ہوئے طلبا کی ضروریات کے مطابق انہیں ترتیب دیتا ہے اس لیے وہ ایک خالق (Creator) کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔
تدریسی امدادی آلات (Teaching Aids)	درسی کتاب (Text Book)، تختہ سیاہ (Black Board)، مختلف قسم کے چارٹس اور ماڈل وغیرہ اپنے مضمون کے مختلف تصورات کو واضح کرنے میں مدد کرتے ہیں اس لیے انہیں تدریسی امدادی وسائل کہا جاتا ہے۔
نصاب کا معملہ (Curriculum Transaction)	نصاب کے نکات کی منصوبہ بندی، پیش کشی اور اس کی تدریس تک کے عمل کو مجموعی طور پر نصاب کا معاملہ (Curriculum Transaction) کہا جاتا ہے۔

5.10 اکائی کے اختتام کی سرگرمیاں (Unit End Activities)

معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ تدریس ایک مقدس ---------- ہے

(a) دھندا (b) پیشہ (c) دولت کمانے کا ذریعہ (d) غلامی

2۔ کسی ملک وسماج کے مستقبل کا دارومدار اصلاً -------- پر ہوتا ہے۔

(a) قدرتی وسائل (b) مالی وسائل (c) بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت (d) سائنسی ترقی

3۔ پیشۂ تدریس کا حق ادا کرنے کے لیے معلم کے پاس ------- اور ------- ضروری ہیں۔

(a) غیر معمولی ذہانت اور منظّم منصوبہ مندی (b) پیشہ ورانہ اہلیتیں اور پابندی عہد

(c) افسران کی فرمانبرداری اور سماجی خدمت (d) سیاسی اثر ورسوخ اور سماجی حیثیت

4۔ معلم کی پیشہ ورانہ اہلیتوں میں نفس مضمون پر عبور، تدریسی امدادی آلات کی تیاری و استعمال اور۔۔۔۔۔۔شامل ہیں۔

(a) سرپرستوں سے گہرے تعلقات (b) پیشہ ورانہ تنظیموں سے تعلق

(c) پر مغز مضامین کی اشاعت (d) نصاب کا معملہ

5۔ تدریسی امدادی آلات۔۔۔۔۔۔قسم کے ہوتے ہیں۔

4(a) 3(b) 5(c) 6(d)

6۔ کمرہ جماعت کے تعاملات (Interaction) میں جمہوری اقدار کا خیال رکھنے کا مطلب ہے

(a) معلم صرف اپنی بات پیش کرے (b) طلبا آپس میں گفتگو کرتے رہیں

(c) بامعنی پیش کشی کے لیے ہر ایک کو موقع ملے (d) طلبا نمائندوں کو موقع ملے

7۔ طلبا کے درمیان تعاملات کے لیے معلم کی حوصلہ افزائی اور۔۔۔۔۔۔غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔

(a) رہنمائی (b) خاموشی (c) عدم موجودگی (d) نظر

8۔ اپنے پیشے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کے احساس کو۔۔۔۔۔کہتے ہیں۔

(a) پیشہ ورانہ استعداد (b) پیشہ ورانہ دلچسپی (c) پیشہ ورانہ مہارت (d) پیشہ ورانہ پابندی عہد

9۔ معلم کی پابندی عہد (Commitment) کا سب سے پہلا اور اہم ترین علاقہ۔۔۔۔۔۔۔ہیں۔

(a) افراد خاندان (b) اسٹاف کے ارکان (c) طلبا (d) سرپرستان طلبا

10۔ ۔۔۔۔۔کو بچوں کے لیے بہترین مثالی شخصیت (Role Model) بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(a) معلم (b) صدر مدرس (c) سیاسی رہنما (d) فلمی اداکار

مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ تدریس کو ایک پیشہ کیوں کہا جاتا ہے؟

2۔ معلم کی پیشہ ورانہ اہلیتیں (Professional Competencies) کون کون سی ہیں؟

3۔ معلم کو اپنے مضمون پر عبور حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

4۔ تدریسی امدادی آلات کی خوبیاں بیان کیجیے۔

5۔ تدریسی امدادی آلات کی قسمیں کون کون سی ہیں؟

طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ معلم کو معمارِ قوم کیوں کہا جاتا ہے؟ مستقبل کے سماج کی تعمیر و تشکیل میں معلم کے کردار کی تفصیل سے وضاحت کیجیے۔

2۔ دورِ حاظر میں معلم کی عزت و احترام میں کمی کیوں محسوس کی جا رہی ہے؟ ملک میں معلم کے مقام میں بہتری لانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہیے؟

3۔ معلم کا اپنے مضمون پر عبور حاصل کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس سلسلے میں معلم کو کن روایتی اور جدید وسائل سے استفادہ کرنا چاہیے؟

4۔ تدریسی امدادی آلات سے کیا مراد ہے؟ معلم کو ان آلات کا استعمال کیوں کرنا چاہیے؟ تدریسی امدادی آلات کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے بتائیے کہ ان کا موثر استعمال کس طرح کیا جاتا ہے؟

5.11 تجویز کردہ مواد (Suggested Readings)

1- Jamal Sajid (2012).Education in Emerging Indian society, Delhi,

2- Shipra Mrunalini .T(2015) Philosophical Foundations of Education, Hyderabad, Neel Kamal publications publishers

3- Lachanna G et.al(2015)Foundations of Education,Hyderabad Neel kamal publishers

4- Ghanta (2004)Foundations of Educations , Hyderabad Neel Kamal

5- Vanaja M et.al(2011) value oriented Education,Hyderabad :Neel Kamal

6- Value Education Google weblight.com

7- Education _General Knowledge

8- www.gktoday.in>blog>importance

9- https://en.m.wikipedia.org wiki valuechildren,deccan Herald

10- Brahma Kumar Nikung(2014)august 03,sunday value.education for

11- Sanjna vij(2010)december 08,crisis of values _who is responsible..

نمونہ امتحانی پرچہ/ Model Examination Paper

تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

جملہ نشانات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

یہ پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

ا۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں / خالی جگہ پُر کرنا/ مختصر جوابوالے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوالکے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ (1x1=10 Marks10)

۲۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 5 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ہر سوال کے لیے 06 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

۳۔ حصہ سوم میں 5 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوال کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباپانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ہر سوالکے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔ (1x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:(1)

(i) ٹیگور کہاں پیدا ہوئے؟

(a) کلکتہ (b) الہ آباد (c) لکھنؤ (d) ممبئ

(ii) "Towards an Englihtened Human Society" یہ کس کمیٹی کی رپورٹ کا نام ہے؟

(a) رام مورتی کمیٹی (b) یش پال کمیٹی (c) مدالیار کمیٹی (d) قومی تعلیمی پالیسی

(iii) وڈز ڈسپاچ کب شائع ہوا؟

(a) 1945 (b) 1857 (c) 1854 (d) 1857

(iv) "اسودار کی معنویت صرف اس وقت ہوتی ہے جب وہ فرد اور سماج کے لیے کار آمد ہوتی ہے" یہ بیان کس کی عکاسی کرتا ہے۔

(a) فلسفہ تصوریت (b) فلسفہ عملیت (c) جموہوریت (d) فلسفہ جودیت

(v) یوگا کی فلسفہ کی عملی شکل ہے؟

(a) دھرما (b) سالکھیہ (c) دویتہ (d) نیایہ

(vi) کمرہ جماعت کے تعاملات (Interaction) میں جمہوری اقدار کا خیال رکھنے کا مطلب ہے۔

(a) معلم صرف اپنی بات پیش کرے (b) طلبا آپس میں گفتگو کرتے رہیں

(c) بامعنی پیش کشی کے لیے ہر ایک کو موقع ملے (d) صرف طلبا نمائندوں کو موقع ملے

(vii) اپنے پیشے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کے احساس کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں

(a) پیشے ورانہ استعداد (b) پیشے ورانہ دلچسپی (c) پیشے ورانہ مہارت (d) پیشہورانہ پابندی عہد

(viii) توصف کے بنیادی اصولوں میں سے نہیں ہے؟

(a) ایمان (b) اسلام (c) تبلیغ دین (d) احسان

(ix) ذیل میں فلسفہ فطرت کے اہم فلاسفر ہیں۔

(a) ہربٹ اسپنر (b) جان دیوی (c) کلپاٹرک (d) سقرات

(x)مغلیہ دور میں ذریعہ تعلیم تھا۔

(a) عربی (b) ہندی (c) فارسی (d) ترکی

حصہ دوم

(2) ایک معلم کو فلسفہ کیوں جاننا چاہئے؟ سمجھائیں۔

(3) فلسفہ اور تعلیم کے باہمی رشتہ پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(4) اقدار (Value) کے تصورات کو واضح کرتے ہوئے اقدار کی درجہ بندی پر نوٹ لکھئے۔

(5)اقدار میں بحران کا ذمہ دار آپ کن عوامل کو مانتے ہیں؟

(6) فلسفہ وجودیت کا کوئی مستقل فلسفہ نہیں ہے؟واضح کیجیے۔

(7)فلسفہ عملیت میں مابعد الطبیعیات کے تعلق سے کون سے خیالات پائے جاتے ہیں؟

(8)صوفی ازم کے اہم فلسفیانہ نکات کو مختصراً لکھئے۔

(9)ویدوں کے دور تعلیم کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

حصہ سوم

(10) "مسلم دور میں مدارس میں مذہبی تعلیم کے علاوہ اس دور کے جدید مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں" تفصیلی طور راپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

(11) تصوف کے بنیادی اصولوں پر بحث کیجیے۔

(12)معلم کے معمار قوم کیوں کہا جاتا ہے؟سماج کی تعمیر وتشکیل میں معلم کے کردار تفصیل سے وضاحت کیجیے۔

(13)لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی کا تفصیل سے جائزہ لیجئے۔

(14)کوٹھاری کمیشن کی سفارشات پر تفصیل روشنی ڈالیے۔